ماہنامہ
اشراق
لاہور
جون ۲۰۲۵ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 46 سال

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑالی جاتی ہے، جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔“

—— دین و دانش

- اِس (قربانی) کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ (دین و دانش)
- یہ (قربانی)، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسۡمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكۡبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ در حقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔ (دین و دانش)
- قرآن مجید میں دعوت کا مرکزی نکتہ فلاح آخرت ہے۔ فلاح آخرت کے لیے لازم ہے کہ زندگی ایمان برحق اور اعمال صالحہ سے عبارت ہو۔ اثم، فاحشات اور سرکشی سے مکمل اجتناب ہو اور عدل و احسان اور مدد و اعانت پر بھرپور عمل ہو۔ (شذرات)
- قرآن مجید میں متعدد جگہ پر ان اعمال کو بیان کیا گیا ہے جو ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہیں۔ ان میں اللہ کے حوالے سے اسے الٰہ واحد ماننے اور اس کی عبادت کا ذکر ہوتا ہے اور بندوں کی نسبت سے اعلیٰ اخلاقی اعمال بیان کیے جاتے ہیں۔ (شذرات)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۷ شمارہ ۶ جون ۲۰۲۵ء ذوالحجہ ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات		
احوال باطن	طالب محسن	۴
قرآنیات		
البیان: الشوریٰ ۴۲: ۱-۱۰ (۱)	جاوید احمد غامدی	۶
معارف نبوی		
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ابتدائی لوگ	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۱۱
دین و دانش		
قربانی	جاوید احمد غامدی	۲۶
سیر و سوانح		
مہاجرین حبشہ (۳۷)	محمد وسیم اختر مفتی	۲۸
نقطۂ نظر		
تفسیر "مفتاح القرآن" کا ایک علمی مطالعہ (۳)	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۳۴
صوفیت اور نجات	ڈاکٹر عدیل احمد	۴۳
نقد و نظر		
مولانا امین احسن اصلاحی کے بارے میں شدید غلط بیانی	صاحب زادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی	۵۲
"مولانا امین احسن اصلاحی کے بارے میں شدید غلط بیانی" کے جواب میں	محمد بلال	۵۹
اصلاح و دعوت		
فطرت کی طرف	محمد ذکوان ندوی	۶۵
شخصیات		
حیات امین احسن (۲۱)	محمد بلال	۷۰

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

طالب محسن

احوال باطن

بندۂ مومن کا خدا سے تعلق بندگی کا ہے۔ برصغیر کی مذہبی روایت میں بندگی دو پہلوؤں سے عبارت ہے۔ ایمان و عمل کی صالحیت اور دوسرا احوال قلب کا ظہور۔ جب ہم علما کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو عام طور پر ایمان و عمل کے مباحث سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بیان دین کے مقصد سے لکھی گئی کتابیں زیادہ تر اس ضرورت کو پورا کرتی ہیں کہ قاری ایمانیات اور شریعت کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کرے، لیکن جب ہم صوفیہ کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بیان دین کے مباحث کم اور اصل زور احوال باطن کے بیان پر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ کتابیں تصوف کے فکری اور عملی پہلوؤں کو بھی بیان کرتی ہیں، لیکن اس وقت ان پر کلام پیش نظر نہیں ہے، صرف اتنی بات کہنا کافی ہے کہ اصول میں فکر تصوف کے باطنی اہداف اور ہیں اور بندگی کے باطنی احوال شئ دیگر ہیں۔ اگرچہ بعض الفاظ اور تعبیرات یہ مکاتب فکر مشترک بھی استعمال کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں دعوت کا مرکزی نکتہ فلاح آخرت ہے۔ فلاح آخرت کے لیے لازم ہے کہ زندگی ایمان بر حق اور اعمال صالحہ سے عبارت ہو۔ اثم، فاحشات اور سرکشی سے مکمل اجتناب ہو اور عدل و احسان اور مدد و اعانت پر بھرپور عمل ہو۔ قرآن مجید میں متعدد جگہ پر ان اعمال کو بیان کیا گیا ہے جو ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہیں۔ ان میں اللہ کے حوالے سے اسے الٰہ واحد ماننے اور اس کی عبادت کا ذکر ہوتا ہے اور بندوں کی نسبت سے اعلیٰ اخلاقی اعمال بیان کیے جاتے ہیں۔ ان مقامات کے مطالعے سے واضح ہے کہ دینی شعور ان حقائق کے ادراک سے تکمیل پاتا ہے جو اللہ کی ہستی اور انسانوں کے بارے میں اس کے فیصلوں کے علم سے متعلق ہیں۔ اور دینی زندگی ان اعمال سے

وجود پذیر ہوتی ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی حیثیت سے بندۂ مومن پر عائد ہوتے ہیں۔ پہلے پہلو کے لیے جامع لفظ 'ایمانیات' ہے اور دوسرے کے لیے کامل تعبیر 'اعمال صالحہ' کی ہے۔

انسان اپنے ادراکات اور حاصلات کے مطابق اپنے اندر احوال بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ احوال باطن و ظاہر میں آنے والی تبدیلیوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

اللہ کی صفات اور اللہ کے مقام کا شعور اللہ کے لیے بندے کے اندر صرف اطاعت پیدا نہیں کرتا، بلکہ توکل، تفویض، انابت، یاد اور ہر حال میں راضی برضا ہونے کے احوال بھی پیدا کرتا ہے۔ دینی اعمال پر عمل میں صرف صحت عمل کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ عمل میں درجۂ احسان کو پانے کا ذوق و شوق بھی پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ حسن سلوک صرف حقوق کی ادائیگی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ عفو، درگذر، ایثار اور بے نفسی کی منازل بھی طے ہوتی ہیں۔ دین اور دین کے شعائر کے ساتھ تعلق صرف تعمیل و امتثال اور تعظیم ہی کا نہیں ہوتا، بلکہ ان کے ساتھ وابستگی حمیت و حمایت کے پیرہن میں ملبوس ہوتی ہے۔

ظاہر و باطن کے یہ تمام پہلو وجود پذیر ہوں تو بندۂ مومن وہ فضائل اور جمال و کمال حاصل کرتا ہے جو اسے آخرت میں فردوس بریں کی زندگی اور رضوان من اللہ کے مرتبے پر فائز کریں گے۔

ان سطور سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ باطنیت اور سریت کے جو تصورات ہمارے ہاں رائج ہیں قرآن و سنت میں ان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ، دونوں خدا کی صفات و عظمت کا صحیح شعور پیدا کرتے ہیں اور بندگی کے تعلق میں جو قلب و ذہن بنتا ہے اور عبادات و معاملات میں جو جادۂ مستقیم مطلوب ہے، اس کو واضح کرتے ہیں۔ جس طرح دنیا کی کشش انسانوں کو پاکیزہ اعمال سے دور کر دیتی ہے، اسی طرح باطنیت اور سریت کی کشش بندگی کے صحیح شعور سے ہٹا دیتی ہے۔ اسی لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور اس سے انحراف نہ کرو۔

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الشورٰی

(۱)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ كَذٰلِكَ يُوۡحِيۡٓ اِلَيۡكَ وَاِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۙ اللّٰهُ الۡعَزِيۡزُ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ ’حٰمٓ عٓسٓقٓ‘ ہے۔[3] اللہ، غالب اور حکیم[4] اِسی طرح تمھاری طرف وحی کرتا ہے اور

۳۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔ پچھلی سورہ کا نام بھی ’حٰمٓ‘ ہے۔ یہاں اُس پر ’عٓسٓقٓ‘ کا اضافہ ہے۔ یہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ سورۂ حٰمٓ السجدہ کے ساتھ اِس سورہ کا تعلق ایک تکملہ یا تتمہ کا ہے جس میں بعض خاص مطالب کی توضیح کی گئی ہے جو پچھلی سورہ میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔

۴۔ یعنی جو زبردست ہے اور چاہے تو گردن کشوں کی گردن دبا سکتا ہے، لیکن وہ حکیم بھی ہے، اِس لیے اُنھیں مہلت دیتا اور اُن کی ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرماتا ہے —— مدعا یہ ہے کہ آپ بھی اپنے رب عزیز و حکیم پر بھروسا رکھیں۔ آپ کے مخاطبین کی مہلت ختم ہو جائے گی تو یہ بھی اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔

الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۴﴾
تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ
وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَالَّذِيْنَ

جو تم سے پہلے گزرے ہیں، اُن کی طرف بھی اِسی طرح وحی کرتا رہا ہے، (اِنھی مطالب کے ساتھ اور اِسی طریقے سے)۔[۷۵] آسمانوں میں جو کچھ ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اُسی کا ہے اور وہ برتر اور عظیم ہے۔[۷۶] قریب ہے کہ آسمان (اُس کی ہیبت کے مارے) اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے، وہ تو اپنے پروردگار (کی خشیت کے سبب سے اُس) کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح[۷۷] اور زمین والوں

۷۵۔ یعنی اُسی دین کی تعلیمات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو وحی کے ذریعے سے دیا۔ چنانچہ اِس قرآن میں نہ کوئی نیا دین بیان ہوا ہے اور نہ اُس کے دینے کے لیے پچھلے پیغمبروں کے طریقے سے مختلف کوئی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن کے مخاطبین جن چیزوں پر اصرار کر رہے ہیں کہ خدا خود اپنے فرشتوں کے ساتھ بدلیوں میں نمودار ہو یا اُن میں سے ہر شخص سے براہ راست رابطہ کر کے اُس کو اپنا پیغام پہنچائے، اِن میں سے کوئی طریقہ بھی خدا نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اُس کا طریقہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ انسانوں میں سے اپنے کچھ خاص بندوں کو وہ نبوت کے لیے منتخب کرتا ہے، پھر اُن کو وحی کے ذریعے سے اپنا پیغام دیتا اور اُنھی کے ذریعے سے اُس کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

۷۶۔ لہٰذا اُس کی بارگاہ میں اِس طرح کے مطالبات پیش کرنے کی جسارت کسی کو بھی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سامنے آئے اور لوگوں سے خود ہم کلام ہو۔

۷۷۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور حمد میں اثبات کا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو تمام خلاف شان باتوں سے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شرک ہے، پاک اور تمام اعلیٰ صفات سے، جن میں سب سے مقدم توحید ہے، متصف قرار دیتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تمام قربت کے باوجود، جو فرشتوں کو خدا کی بارگاہ میں حاصل ہے، اُن کا حال یہ ہے کہ خدا کی خشیت سے لرزاں و ترساں ہیں اور یہ احمق اُنھیں معبود بنائے بیٹھے ہیں، جب کہ وہ اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کسی کو خدا کا شریک ٹھیرا دیں۔

اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦﴾
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا
وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ ﴿٧﴾

کے لیے مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔[۷۸] سنو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اِس کے باوجود جن لوگوں نے اُس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، اللہ اُن پر نگران ہے[۷۹] اور، (اے پیغمبر)، تم اُن پر ذمہ دار نہیں بنائے گئے ہو۔[۸۰] ۱-۶

اِسی طرح، (جیسے کہ بیان ہوا) ہم نے ایک عربی قرآن[۸۱] تمھاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم مکہ والوں[۸۲] کو اور اُس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو،[۸۳] خاص کر اُس دن سے خبردار کر دو

۷۸۔ یعنی زمین پر جو اہل ایمان ہیں، اُن کی مغفرت کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ یہی اُن کی شفاعت ہے۔ اِس سے آگے کوئی چیز اُن کے اختیار میں نہیں ہے۔

۷۹۔ یہ نہایت سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نگران ہے تو اِن کے تمام کرتوتوں کو دیکھ بھی رہا ہے، لہٰذا مہلت پوری ہو جائے گی تو اِن کو اِن کے انجام تک پہنچا دے گا۔

۸۰۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمھاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے۔ اِس لیے یہ نہیں مانتے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِن کی پرسش اِنھی سے ہونی ہے، تم سے نہیں ہونی ہے۔

۸۱۔ قرآن کے ساتھ 'عَرَبِيّ' کی صفت بطور امتنان اور اتمام حجت ہے کہ اِس کے بعد اہل عرب کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

۸۲۔ اصل میں لفظ 'اُمَّ الْقُرٰى' استعمال ہوا ہے۔ یہ مرکزی بستی کو کہتے ہیں اور عرب میں مرکزی بستی کی حیثیت مکہ ہی کو حاصل تھی۔ یہ بھی، ظاہر ہے کہ اتمام حجت کے پہلو سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اگر ایک پیغام مرکزی بستی کے لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُس ملک کے لوگوں کو اُن کے سر پر چڑھ کر پکار دیا گیا ہے۔ اگر 'اُمُّ الْقُرٰى' کے بجاے عرب کے کسی گوشے سے یہ دعوت اٹھتی تو باتیں بنانے والے یہ بات بنا سکتے تھے کہ آخر ہمارے اکابر و سادات اور ہمارے ذہین طبقہ کو

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ
رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٨﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ
اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٩﴾

جو سب لوگوں کے جمع ہونے کا دن ہے، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اُس دن ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔ ۷

(اِس سے زیادہ تمھاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے)۔ اگر اللہ چاہتا تو اِن سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن (اُس نے لوگوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی، لہٰذا اب) وہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)[۸۴] اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور رہے وہ لوگ جو اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے ہیں تو اُن کا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ کیا اِن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں؟ تو یاد رکھیں کہ اللہ ہی کارساز ہے، وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور (یہ اُس کے لیے

چھوڑ کر قرآن نے سب سے پہلے عوام کے طبقے کو کیوں مخاطب کیا، اُس کے حق و باطل کے اصلی پرکھنے والے تو مکہ کے سادات ہو سکتے تھے!'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۴۳)

۸۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست اہل عرب کی طرف ہوئی تھی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی دوسری تمام قومیں بھی آپ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کی مکلف ہیں، لیکن اُن تک پیغام پہنچانے کی ذمہ داری قرآن نے براہ راست آپ پر نہیں، بلکہ آپ کی قوم بنی اسمٰعیل پر ڈالی ہے جس میں تبعاً دوسرے مسلمان بھی شریک ہیں۔ اِس کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو گئی ہے۔

۸۴۔ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ اُس کی رحمت کے مستحق وہی ہوں گے جو شرک اور نافرمانی اختیار کر کے اپنی جان پر ظلم نہیں ڈھائیں گے، بلکہ خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور اُس کی ہدایت کی قدر کریں گے۔ قرآن میں یہ قانون متعدد جگہوں پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو کوئی بدل نہیں سکتا، لیکن اُس کی یہ مشیت اندھا دھند نہیں ہے، یہ اُس کے عدل اور اُس کی حکمت کے تحت ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖۚ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿١٠﴾

کچھ بھی مشکل نہیں)، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم[85] جن چیزوں میں بھی کوئی اختلاف رکھتے ہو، (خواہ وہ توحید ہے یا آخرت)، اُس کا فیصلہ اللہ ہی کے حوالے ہے۔ وہی اللہ میرا پروردگار ہے، اُسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ ۸-۱۰

۸۵۔ یہاں سے متکلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے ہیں۔ گویا اوپر جو فرمایا تھا کہ تمھاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ ہے، اِس کے بعد لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے تو آپ نے اُس کی تعمیل کر دی۔

[باقی]

سیرۃ النبی

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ابتدائی لوگ

— ۱ —

عَنْ شَدَّادِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الدِّمَشْقِيِّ – وَكَانَ قَدْ أَدْرَكَ نَفَرًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ – قَالَ:[1] قَالَ أَبُو أُمَامَةَ: يَا عَمْرُو بْنَ عَبَسَةَ – صَاحِبَ الْعَقْلِ عَقْلِ الصَّدَقَةِ –، رَجُلٌ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ بِأَيِّ شَيْءٍ تَدَّعِي أَنَّكَ رُبُعُ الْإِسْلَامِ؟

قَالَ: [رَغِبْتُ عَنْ آلِهَةِ قَوْمِي فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَرَأَيْتُ أَنَّهَا آلِهَةٌ بَاطِلَةٌ، يَعْبُدُونَ الْحِجَارَةَ، وَالْحِجَارَةُ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ.

فَلَقِيتُ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَسَأَلْتُهُ عَنْ أَفْضَلِ الدِّينِ فَقَالَ: يَخْرُجُ رَجُلٌ بِمَكَّةَ وَيَرْغَبُ عَنْ آلِهَةِ قَوْمِهِ وَيَدْعُو إِلَى غَيْرِهَا وَهُوَ يَأْتِي

بِأَفْضَلِ الدِّينِ. فَإِذَا سَمِعْتَ بِهِ فَاتَّبِعْهُ.[٢]

فَلَمْ يَكُنْ لِي هَمٌّ إِلَّا مَكَّةَ فَآتِيهَا فَأَسْأَلُ: هَلْ حَدَثَ فِيهَا أَمْرٌ؟ فَيَقُولُونَ: لَا، فَأَنْصَرِفُ إِلَى أَهْلِي، وَأَهْلِي مِنَ الطَّرِيقِ غَيْرُ بَعِيدٍ، فَأَعْتَرِضُ الرُّكْبَانَ خَارِجِينَ مِنْ مَكَّةَ فَأَسْأَلُهُمْ: هَلْ حَدَثَ فِيهَا خَبَرٌ أَوْ أَمْرٌ؟ فَيَقُولُونَ: لَا، وَإِنِّي لَقَائِمٌ عَلَى الطَّرِيقِ إِذْ مَرَّ بِي رَاكِبٌ فَقُلْتُ: مِنْ أَيْنَ جِئْتَ؟ فَقَالَ: مِنْ مَكَّةَ، فَقُلْتُ: هَلْ حَدَثَ فِيهَا خَبَرٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، رَجُلٌ رَغِبَ عَنْ آلِهَةِ قَوْمِهِ وَدَعَا إِلَى غَيْرِهَا، قُلْتُ: صَاحِبِي الَّذِي أُرِيدُ.

فَشَدَدْتُ عَلَى رَاحِلَتِي]،[٣] [فَأَقْبَلْتُ إِلَى مَكَّةَ أَسْأَلُ عَنْهُ، (وَوَجَدْتُ قُرَيْشًا عَلَيْهِ حِرَاصًا جُرَآءَ)[٤] فَأُخْبِرْتُ أَنَّهُ مُخْتَفٍ لَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ إِلَّا بِاللَّيْلِ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ. فَقُمْتُ بَيْنَ الْكَعْبَةِ وَأَسْتَارِهَا فَمَا عَلِمْتُ إِلَّا بِصَوْتِهِ يُهَلِّلُ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ،[٥] فَقُلْتُ: مَا أَنْتَ؟ فَقَالَ: «رَسُولُ اللهِ». فَقُلْتُ: وَبِمَا أَرْسَلَكَ رَبُّكَ؟ قَالَ: «أَنْ يُعْبَدَ اللهُ تَعَالَى وَلَا يُشْرَكَ بِهِ شَيْئًا وَتُحْقَنَ الدِّمَاءُ وَتُوصَلَ الْأَرْحَامُ (وَتُؤَمَّنَ السُّبُلُ وَتُكَسَّرَ الْأَوْثَانُ)».[٦] قُلْتُ: وَمَنْ مَعَكَ عَلَى هَذَا؟ قَالَ: «حُرٌّ وَعَبْدٌ». (قُلْتُ: نِعْمَ مَا أَرْسَلَكَ بِهِ أُشْهِدُكَ أَنِّي قَدْ آمَنْتُ بِكَ وَصَدَّقْتُ قَوْلَكَ)[٧] فَقُلْتُ: ابْسُطْ يَدَكَ أُبَايِعْكَ. فَبَسَطَ يَدَهُ فَبَايَعْتُهُ عَلَى الْإِسْلَامِ، فَلَقَدْ رَأَيْتُنِي رُبُعَ الْإِسْلَامِ]،[٨] قُلْتُ: إِنِّي مُتَّبِعُكَ، قَالَ: «[قَدْ تَرَى كَرَاهَةَ النَّاسِ لِمَا جِئْتُ بِهِ]،[٩] إِنَّكَ لَا تَسْتَطِيعُ ذَلِكَ يَوْمَكَ هَذَا، وَلَكِنِ ارْجِعْ إِلَى

أَهْلِكَ، فَإِذَا سَمِعْتَ بِي قَدْ ظَهَرْتُ فَالْحَقْ بِي».

قَالَ: فَرَجَعْتُ إِلَى أَهْلِي وَقَدْ أَسْلَمْتُ، فَخَرَجَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُهَاجِرًا إِلَى الْمَدِينَةِ، فَجَعَلْتُ أَتَخَبَّرُ الْأَخْبَارَ حَتَّى جَاءَ رَكَبَةٌ مِنْ يَثْرِبَ، فَقُلْتُ: مَا هَذَا الْمَكِّيُّ الَّذِي أَتَاكُمْ؟[1] قَالُوا: أَرَادَ قَوْمُهُ قَتْلَهُ، فَلَمْ يَسْتَطِيعُوا ذَلِكَ، وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَهُ، وَتَرَكْنَا النَّاسَ سِرَاعًا، قَالَ عَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ: فَرَكِبْتُ رَاحِلَتِي حَتَّى قَدِمْتُ عَلَيْهِ الْمَدِينَةَ، فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَتَعْرِفُنِي؟ قَالَ: «[نَعَمْ، أَنْتَ السُّلَمِيُّ الَّذِي جِئْتَنِي بِمَكَّةَ، فَقُلْتُ لَكَ: كَذَا وَكَذَا، وَقُلْتَ لِي: كَذَا وَكَذَا]»[2] قَالَ: قُلْتُ: بَلَى....

شداد بن عبد اللہ دمشقی سے روایت ہے —— اِنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ کا زمانہ پایا تھا —— وہ کہتے ہیں: ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے دِیتوں کا بار اتارنے میں صدقہ کرنے والے بنو سُلیم[1] کے فرد عمرو بن عبسہ[2] رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ یہ دعویٰ کس طرح کرتے ہیں کہ آپ اسلام قبول کرنے والے چوتھے فرد ہیں؟

اُنھوں نے بتایا: میں زمانۂ جاہلیت ہی میں اپنی قوم کے خداؤں سے بے زار تھا۔ میں اُنھیں معبودانِ باطل خیال کرتا تھا۔ وہ لوگ پتھروں کو پوجتے تھے اور پتھر نہ کوئی نقصان دے سکتے ہیں نہ نفع۔

پھر میں اہل کتاب کے ایک آدمی سے ملا تو میں نے اُس سے پوچھا: کون سا دین بہترین ہے؟ اُس نے بتایا کہ مکہ میں ایک آدمی ظاہر ہو گا، جو اپنی قوم کے معبودوں کو چھوڑ دے گا اور اُن کے سوا کسی اور معبود کی طرف بلائے گا۔ وہ سب سے بہتر دین لائے گا۔ جب تم اُس کے بارے میں سنو تو

اُس کی پیروی کرنا۔[4]

بس (اِس کے بعد) میرا مقصد مکہ کو جانا ہی ہوا کرتا تھا، لہٰذا میں (موقع بہ موقع) وہاں جایا کرتا اور لوگوں سے پوچھتا: یہاں کوئی خاص واقعہ ہوا ہے؟ وہ کہا کرتے: نہیں، تو میں گھر لوٹ آتا۔ میرا گھر مکے کے راستے سے زیادہ دور نہ تھا، لہٰذا میں مکہ سے باہر جانے والے قافلوں سے بھی پوچھا کرتا تھا کہ مکہ کی سناؤ، وہاں کی کوئی خاص خبر ہے یا کوئی واقعہ وہاں ہوا ہے؟ وہ کہا کرتے: نہیں۔ (اِسی دوران میں ایک دن)، جب میں راستے میں کھڑا تھا، ایک سوار میرے پاس سے گزرا۔ میں نے اُس سے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ اُس نے کہا: مکہ سے۔ میں نے پوچھا: وہاں کی کوئی خبر؟ اُس نے کہا: ہاں، وہاں ایک آدمی نے اپنی قوم کے معبودوں کو چھوڑ دیا ہے اور اب وہ لوگوں کو کسی اور معبود کی طرف بلاتا ہے۔ میں نے دل میں کہا: یہی تو وہ آدمی ہے، جس کی مجھے تلاش تھی۔

چنانچہ میں نے رخت سفر باندھا اور مکہ کا رخ کیا۔ میں آپ کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں نے قریش کو آپ کے سخت خلاف پایا۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ وہ تو چھپے ہوئے ہیں اور اُن تک صرف رات کے وقت پہنچا جا سکتا ہے، جب وہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ اِس پر میں کعبہ اور اُس کے پردوں کے درمیان (چھپ کر) کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھے آپ کی تسبیح و تہلیل ہی سے آپ کی آمد کی خبر ہوئی۔ میں نے یہ دیکھا تو آپ کے سامنے آگیا اور آپ سے پوچھا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں اللہ کا پیغام بر ہوں۔ میں نے پوچھا: آپ کے پروردگار نے آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ اللہ ہی کی عبادت کی جائے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا جائے، خون نہ بہایا جائے، صلۂ رحمی کی جائے، راستوں کو پُرامن بنایا جائے اور بتوں کو توڑ دیا جائے۔[5] میں نے پوچھا: (اِس دین میں) آپ کے ساتھ کون کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک آزاد اور ایک غلام۔[6] میں نے کہا: کیا ہی اچھا پیغام دے کر اللہ نے آپ کو بھیجا ہے، میں آپ کے سامنے گواہی دیتا ہوں کہ میں آپ پر ایمان لایا اور آپ کی بات کو میں نے سچ مان لیا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا: آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں، میں آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے آپ سے اسلام پر

بیعت کرلی۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ میں چوتھا اسلام لانے والا ہوں۔ میں نے عرض کیا: میں آپ (کے ساتھ رہ کر آپ) کی پیروی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: جو پیغام میں لے کر آیا ہوں، اُس سے لوگوں کی ناگواری تم دیکھ ہی رہے ہو۔ اِن حالات میں تمھارے لیے یہ ممکن نہ ہوگا۔ اِس لیے یہی بہتر ہے کہ ابھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ جاؤ۔ پھر جب تمھیں معلوم ہو کہ میرا غلبہ ہو گیا ہے تو میرے پاس آجانا۔

عمرو بن عبسہ کہتے ہیں: میں اسلام قبول کرنے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ پھر (ایک عرصہ بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ میں (اِس عرصے میں وہیں اپنے گھر میں بیٹھا)، آپ کے بارے میں لوگوں سے خبریں لیتا رہتا تھا، یہاں تک کہ مدینہ کے کچھ سوار آئے اور میں نے اُن سے پوچھا: وہ شخص، جو مکہ کا رہنے والا تمھارے پاس آیا ہے، اُس کی کیا خبر ہے؟ اُنھوں نے بتایا: اُن کی قوم اُن کے قتل کے درپے رہی، لیکن خدا کو منظور نہ تھا، اِس لیے وہ کچھ نہ کرسکے اور اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ تیزی سے اُن کی طرف بڑھ رہے (اور اسلام قبول کر رہے) ہیں۔

عمرو بن عبسہ کہتے ہیں: میں نے اپنی سواری پکڑی اور آپ کے پاس مدینے آپہنچا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے گزارش کی: اے اللہ کے رسول، کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تم وہی سُلَّمی ہو، جو میرے پاس مکے میں آیا تھا اور میں نے (اُس وقت) تم سے یہ یہ باتیں کی تھیں اور تم نے مجھ سے یہ اور یہ کہا تھا۔ عمرو کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، میں وہی تو ہوں...۔

۱؎ بنو سلیم قبیلۂ قیس عیلان کی ایک شاخ تھی، جو عدنان کی نسل سے تھے۔ قریش کا تعلق بھی اِسی نسل سے تھا، تاہم یہ قریش میں سے نہیں تھے۔ اِن کے شجرۂ نسب کو دیکھا جائے تو دونوں اوپر مضر بن نزار پر جا کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اِس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: جمہرة انساب العرب، ابن حزم ۴۸۱۔

۲؎ یہ ماں کی طرف سے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔ ملاحظہ ہو: العدة فی شرح العمدة فی

احادیث الاحکام، ابن العطار ۱/ ۳۳۰۔

۳۔ یہ سوال غالباً اِس لیے پوچھا گیا ہے کہ ابتدا میں تو دعوت خاموشی کے ساتھ اور صرف قریش ہی کو دی گئی تھی، پھر اُن میں باہر کا کوئی فرد کس طرح شامل ہو گیا؟

۴۔ اِس سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کے اہل کتاب کس یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ آپ کی پیدایش کس قوم میں اور کہاں ہونے والی ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ وہ تو اُس کو اِس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح کوئی مجہور باپ اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔

۵۔ یہ، اگر غور کیجیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی چیزیں بیان فرمائی ہیں، جن کا تقاضا اُس وقت آپ کے مخاطبین سے ابتدا ہی میں کرنا ضروری تھا۔

۶۔ آزاد سے مراد سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ اور غلام بلال رضی اللہ عنہ ہیں۔

۷۔ یہ بیعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دور صحابہ میں پھر کسی سے کبھی نہیں لی گئی۔ اِس لیے کہ اسلام خدا کا دین ہے اور اُس کی بیعت خدا کی طرف سے مبعوث کسی شخص کے ہاتھ ہی پر کی جا سکتی ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت اصلاً مسند احمد، رقم ۱۷۰۱۹ سے لی گئی ہے۔ اِس کے تنہا راوی عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اِس کے متابعات اِن مراجع میں منقول ہیں:

الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، رقم ۷۷۹۳۔ مسند احمد، رقم ۱۷۰۱۶۔ الآحاد والمثانی، ابن ابی عاصم، رقم ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۹۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۲۶۰، ۱۱۴۷۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۶۶۸۔ معجم ابن الاعرابی، رقم ۱۲۲۔ الشریعہ، آجری، رقم ۹۷۷۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۴۲۲۔ مسند شامیین، طبرانی، رقم ۸۶۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۸۴، ۱۱۶۲، ۴۴۱۸، ۶۵۸۴، ۷۲۴۰۔ معرفۃ الصحابۃ، ابو نعیم، رقم ۴۹۷۷۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۳۰۹۵۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۱۶۸۔

اِس روایت کا کوئی شاہد نہیں ہے۔

۲۔ بعض روایات، مثلاً الآحاد والمثانی، ابن ابی عاصم، رقم ۱۳۲۹ میں اُن کا یہ جواب اِس طرح نقل ہوا ہے:

أُلْقِيَ فِي رُوعِي أَنَّ عِبَادَةَ الْأَوْثَانِ بَاطِلٌ. قَالَ: فَسَمِعَنِي رَجُلٌ وَأَنَا أَتَكَلَّمُ بِذَاكَ

فَقَالَ: يَا عَمْرُو، بِمَكَّةَ رَجُلٌ يَقُولُ كَمَا تَقُولُ.

”میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ بتوں کی عبادت باطل ہے۔ راوی کہتے ہیں: ایک آدمی نے مجھے یہ بات کہتے ہوئے سنا تو کہنے لگا: اے عمرو، مکہ میں ایک شخص ہے، جو وہی کچھ کہتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔“

۳۔ مسند شامیین، طبرانی، رقم ۸۶۳۔

۴۔ ’وَوَجَدْتُ قُرَيْشًا عَلَيْهِ حِرَاصًا جُرَآءَ‘۔ یہ ٹکڑا مسند شامیین، رقم ۸۶۳ سے لیا گیا ہے۔

۵۔ بعض روایات، مثلاً صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۱۴۷ میں ’فَأُخْبِرْتُ أَنَّهُ مُخْتَفٍ لَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ إِلَّا بِاللَّيْلِ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ. فَقُمْتُ بَيْنَ الْكَعْبَةِ وَأَسْتَارِهَا فَمَا عَلِمْتُ إِلَّا بِصَوْتِهِ يُهَلِّلُ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ‘ کے بجاے ’أَتَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَازِلٌ بِعُكَاظَ‘، ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جب کہ آپ عکاظ میں قیام پذیر تھے“ کے الفاظ آئے ہیں۔

۶۔ ’وَتُؤَمَّنَ السُّبُلُ وَتُكَسَّرَ الْأَوْثَانُ‘، یہ ٹکڑا مسند احمد، رقم ۱۷۰۱۶ سے لیا گیا ہے۔

۷۔ ’قُلْتُ: نِعْمَ مَا أَرْسَلَكَ بِهِ أُشْهِدُكَ أَنِّي قَدْ آمَنْتُ بِكَ وَصَدَّقْتُ قَوْلَكَ‘ یہ ٹکڑا مسند شامیین، رقم ۸۶۳ سے لیا گیا ہے۔

۸۔ الآحاد والمثانی، ابن ابی عاصم، رقم ۱۳۲۹۔

۹۔ ’قَدْ تَرَى كَرَاهَةَ النَّاسِ لِمَا جِئْتُ بِهِ‘ یہ ٹکڑا مسند شامیین، رقم ۸۶۳ سے لیا گیا ہے۔

۱۰۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے کے فوراً بعد مدینہ نہیں آئے، بلکہ اِنھوں نے غزوۂ خندق کے بعد کسی وقت ہجرت کی“ (الفتح الربانی فقہی ترتیب مسند احمد ۳۳۵/۲۲)۔

۱۱۔ ’نَعَمْ أَنْتَ السُّلَمِيُّ الَّذِي جِئْتَنِي بِمَكَّةَ، فَقُلْتُ لَكَ: كَذَا وَكَذَا، وَقُلْتَ لِي: كَذَا وَكَذَا‘ یہ جملہ مسند شامیین، رقم ۸۶۳ سے لیا گیا ہے۔

— ۲ —

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ:[۱] أَوَّلُ مَنْ أَظْهَرَ إِسْلَامَهُ سَبْعَةٌ:

رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبُو بَكْرٍ، وَعَمَّارٌ، وَأُمُّهُ سُمَيَّةُ، وَصُهَيْبٌ،[2] وَبِلَالٌ، وَالْمِقْدَادُ، فَأَمَّا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِعَمِّهِ أَبِي طَالِبٍ، وَأَمَّا أَبُو بَكْرٍ، فَمَنَعَهُ اللّٰهُ بِقَوْمِهِ، وَأَمَّا سَائِرُهُمْ فَأَخَذَهُمُ الْمُشْرِكُونَ، فَأَلْبَسُوهُمْ أَدْرَاعَ الْحَدِيدِ، وَصَهَرُوهُمْ فِي الشَّمْسِ، فَمَا مِنْهُمْ إِنْسَانٌ إِلَّا وَقَدْ وَاتَاهُمْ عَلَى مَا أَرَادُوا، إِلَّا بِلَالٌ، فَإِنَّهُ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فِي اللّٰهِ، وَهَانَ عَلَى قَوْمِهِ، فَأَعْطَوْهُ الْوِلْدَانَ، وَأَخَذُوا يَطُوفُونَ بِهِ شِعَابَ مَكَّةَ، وَهُوَ يَقُولُ: أَحَدٌ، أَحَدٌ.

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ابتدا میں اسلام کو علانیہ قبول کرنے والے سات افراد تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود، ابو بکر، عمار، اُن کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ (مشرکین مکہ نے جب اِن کے اسلام لانے پر شدید رد عمل ظاہر کیا تو) جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے، آپ کو تو اللہ نے آپ کے چچا ابو طالب کے ذریعے سے محفوظ رکھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اُن کی قوم کے ذریعے سے بچایا۔ رہے باقی افراد، (جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے آزمایش مقدر کر رکھی تھی) تو اُنھیں مشرکین نے پکڑ لیا۔ وہ اُنھیں لوہے کی زرہیں پہناتے اور دھوپ میں جھلسنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ اُن میں سے بلال رضی اللہ عنہ کے سوا باقی لوگوں نے (بادل نخواستہ) مشرکین کا مطالبہ پورا کر دیا،[1] لیکن سیدنا بلال نے اللہ کی راہ میں اپنی ذات کو کوئی حیثیت نہ دی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی قوم (قریش) کے لیے آسان ہدف بن گئے۔ وہ اُنھیں (خود عذاب دینے کے بعد) لڑکوں کے حوالے کر دیتے، جو اُنھیں (تنگ کرتے اور ستاتے ہوئے) مکہ کی گھاٹیوں میں گھسیٹتے پھرتے اور سیدنا بلال اِس حال میں بھی 'أحد، أحد' ''وہ اکیلا ہے، وہ اکیلا ہے'' کہتے جاتے تھے۔[2]

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس قبائلی تمدن میں ہوئی تھی، وہاں زیردستوں کے لیے اِس کی کوئی گنجایش نہ تھی کہ اپنے آقاؤں کی مرضی کے خلاف وہ کوئی مذہب اختیار کرلیں، لہٰذا زیادہ تر لوگوں کو اِسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اِس کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

۲۔ بلال رضی اللہ عنہ کی یہی استقامت ہے، جس کی بنا پر صدیق وفاروق جیسے اساطین امت بھی اپنی سعادت سمجھتے تھے کہ اُنھیں سیدنا بلال کہہ کر پکاریں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۳۸۳۲ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے تنہا راوی عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ اِس کے متابعات اِن مراجع میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۳۳، ۳۵۷۹۵، ۳۶۵۹۳۔ فضائل الصحابۃ، احمد بن حنبل، رقم ۱۹۱۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۱۵۰۔ الآحاد والمثانی، ابن ابی عاصم، رقم ۲۶۹۔ مسند بزار، رقم ۱۸۴۵۔ مسند شاشی، رقم ۶۴۱۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۰۸۳۔ الشریعہ، آجری، رقم ۱۲۵۶، ۱۲۵۷۔ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم اصبہانی ۱/ ۱۴۹۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۶۸۹۷۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۱۷۰، ۲۸۱۔

اِس روایت کا کوئی شاہد نہیں ہے۔

۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۳۳ میں 'صہیب' صحابی کی جگہ 'عمر' کا لفظ آیا ہے، اِس حوالے سے یہ روایت شاذ ہے۔

—۳—

عَنْ عَمَّارٍ، يقُولُ:[1] رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا مَعَهُ إِلَّا خَمْسَةُ أَعْبُدٍ، وَامْرَأَتَانِ وَأَبُو بَكْرٍ.

عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا ہے کہ (اسلام لانے والوں میں سے) آپ کے ساتھ پانچ غلاموں، دو عورتوں اور

ابو بکر رضی اللہ عنہم کے سوا اور کوئی نہ تھا۔[1]

۱۔ اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بعد میں وہ وقت بھی دیکھ لیا، جب لوگ ہزاروں کی تعداد میں فوج در فوج آپ کے دین میں داخل ہو گئے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے تہذیبی غلبے کے زمانے میں جن پیغمبروں نے توحید کی دعوت دی ہے، اُن میں سے بعض کے اپنی قوم کو چھوڑ کر جانے کے وقت بھی اتنے لوگ اُن کے ساتھ نہیں تھے، جتنے یہاں ابتدا میں بیان ہوئے ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۳۶۶۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے تنہا راوی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اِس کے متابعات اِن مراجع میں منقول ہیں:

فضائل الصحابۃ، احمد بن حنبل، رقم ۲۳۲۔ صحیح بخاری، رقم ۳۶۶۰، ۳۸۵۷۔ معجم ابن الاعرابی، رقم ۱۲۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۶۸۲۔ معرفۃ الصحابۃ، ابو نعیم، رقم ۵۲۰۶۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۳۰۹۴۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲/ ۱۶۷۔

اِس روایت کا بھی کوئی شاہد نہیں ہے۔

المصادر و المراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (١٤٢٧هـ/٢٠٠٦م). **العلل**. ط ١. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي شيبة عبد الله بن محمد. (١٤٠٩هـ) .**الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار**. ط١. تحقيق: كمال يوسف الحوت. الرياض: مكتبة الرشد.

ابن أبي شيبة أبو بكر عبد الله بن محمد العبسي. (١٩٩٧م). **المسند**. ط١. تحقيق: عادل بن يوسف العزازي

وأحمد بن فريد المزيدي. الرياض: دار الوطن.

ابن أبي عاصم أحمد بن عمرو الشيباني. **الأوائل لابن أبي عاصم**. المحقق: محمد بن ناصر العجمي. الكويت: دار الخلفاء للكتاب الإسلامي.

ابن أبي عاصم أحمد بن عمرو الشيباني. (١٤١١ھ/١٩٩١م). **الآحاد والمثاني**. ط١. تحقيق: د. باسم فيصل أحمد الجوابرة. الرياض: دار الراية.

ابن الأعرابي أبو سعيد أحمد بن محمد البصري. (١٤١٨ھ/١٩٩٧م). **كتاب المعجم**. ط١. تحقيق وتخريج: عبد المحسن بن إبراهيم بن أحمد الحسيني. الناشر: الدمام: دار ابن الجوزي.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠ھ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حبان محمد بن حبان البُستي. (١٤١٤ھ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦ھ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧ھ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: لبنان. مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبد الله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤ھ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن خزيمة أبو بكر محمد بن إسحٰق النيسابوري. (د.ت). **الصحيح**. د.ط. تحقيق: د. محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧ھ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور

همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن سعد محمد بن سعد. (١٤٠٨هـ). **الطبقات الكبرى**. ط ٢. تحقيق: زياد محمد منصور. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

ابن عدي عبد الله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبد القيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن ماجه محمد بن يزيد القزويني. (د.ت). **سنن ابن ماجه**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار الفكر.

ابن المِبْرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو اسحاق الحويني. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو عوانة يعقوب بن إسحٰق. (١٤١٩هـ/١٩٩٨م). **المستخرج**. ط١. تحقيق: أيمن بن عارف الدمشقي. بيروت: دار المعرفة.

أبو نعيم احمد بن عبدالله اصبهاني. (د.ت). **معرفة الصحابة**. ط١. تحقيق: مسعد السعدني. بيروت:

دارالكتاب العلمية.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني. (١٣٩٤ھ/١٩٧٤م). **حلية الأولياء وطبقات الأصفياء.** د. ط. بيروت: دار الكتاب العربي.

الآجُرِّيُّ محمد بن الحسين. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الشريعة.** ط ٢. تحقيق: الدكتور عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي. الرياض: دار الوطن.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال.** ط ٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢١ھ/٢٠٠١م). **مسند الإمام أحمد بن حنبل.** ط ١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون. إشراف: د عبد الله بن عبد المحسن التركي. دار النشر: مؤسسة الرسالة. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨ھ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال.** ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل أبو عبد الله الشيباني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **فضائل الصحابة.** ط١. تحقيق: د. وصي الله محمد عباس. بيروت: مؤسسة الرسالة.

الألباني محمد ناصر الدين. (١٤٢١ھ/٢٠٠١م). **صحيح السيرة النبوية.** ط١. عمان الاردن: المكتبة الإسلامية.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير.** تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت: دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧ھ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط.** ط ١. حلب. القاهرة: دار الوعي مكتبة دار التراث.

البخاري محمد بن إسمٰعيل. (١٤٢٢ھ). **الجامع الصحيح.** ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البزار أحمد بن عمرو. (٢٠٠٩م). **مسند البزار.** ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله، وعادل بن سعد، وصبري عبد الخالق الشافعي. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبري**. ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٥هـ). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. بيروت: دار الكتب العلمية.

الحاكم محمد بن عبد الله المعروف بابن البيع. (١٤١١هـ/١٩٩٠م). **المستدرك على الصحيحين**. ط١. تحقيق: مصطفى عبد القادر عطاء. بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض: دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (٢٠٠٣م). **تاريخ الإسلام وَوَفيات المشاهير وَالأعلام**. ط ١. تحقيق: الدكتور بشار عوّاد معروف. بيروت: دار الغرب الإسلامي.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة: دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحيى شفيق حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت: عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

الشاشي الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله.

المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

الطبراني أبو القاسم سليمان بن أحمد الشامي. (١٤٠٥هـ/١٩٨٤م). **مسند الشاميين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي. بيروت: مؤسسة الرسالة.

الطيالسي سليمان بن داود. (١٤١٩هـ/١٩٩٩م) .**مسند أبي داود الطيالسي** .ط ١. تحقيق: الدكتور محمد بن عبد المحسن التركي. مصر: دار هجر.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة: مكتبة الدار.

الكَشّي أبو محمد عبد الحميد بن حميد بن نصر. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **المنتخب من مسند عبد بن حميد**. ط١. تحقيق: صبحي البدري السامرائي، محمود محمد خليل الصعيدي. القاهرة: مكتبة السنة.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط ١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغرى**. ط٢. تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرى**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

جاوید احمد غامدی

قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے، جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔

قربانی کی تاریخ

اِس کی تاریخ آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اُنھیں جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب پشت بہ پشت لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔ حج و عمرہ کے موقع پر اور عیدالاضحیٰ کے دن یہی قربانی ہے جو ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے

اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔

قربانی کا مقصد

اِس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔

یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسۡمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ أَکۡبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

قربانی کا قانون

اِس کا قانون یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے۔

اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰/ ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اِس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اصطلاح میں اِنھیں 'ایام تشریق' کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے۔ اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔

(الاسلام ۱۱۹- ۱۲۲)

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۳۷)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

[اس مضمون کی چھتیسویں قسط نومبر ۲۰۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس سلسلے کی آخری قسط اس شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔ ادارہ]

حضرت عبداللہ بن مخرمہ رضی اللہ عنہ

نسب نامہ

حضرت عبداللہ بن مخرمہ ہجرت سے انتیس سال پہلے مکہ میں قریش کی شاخ بنو عامر بن لؤی میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ عبدالعزیٰ بن ابو قیس دادا اور عامر بن لؤی آٹھویں جد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نسب لؤی بن غالب پر جا ملتا ہے۔ لؤی کے دوسرے بیٹے کعب آپ کے آٹھویں جد تھے۔ بنو مالک بن کنانہ کی ام نہیک بہنانہ بنت صفوان حضرت عبداللہ کی والدہ تھیں۔

حضرت عبداللہ بن مخرمہ عبداللہ اکبر کے لقب سے مشہور ہیں۔ ابو محمد ان کی کنیت ہے، قریش سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرشی اور عامر بن لؤی کی نسبت سے عامری جانے جاتے ہیں۔

قبول اسلام

ابتداے اسلام میں اسلام کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔

پہلی ہجرت سوے حبشہ

رجب ۵/ نبوی (۶۱۵ء): دین حق کی طرف لپکنے والے مخلصین پر مشرکین مکہ کی ایذائیں حد سے بڑھ گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا: ''تم حبشہ کی سرزمین کو نکل جاؤ، وہاں ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کی سلطنت میں ظلم نہیں کیا جاتا۔ وہ امن اور سچائی کی سرزمین ہے، (وہاں اس وقت تک قیام کرنا) جب تک اللہ تمھاری سختیوں سے چھٹکارے کی راہ نہیں نکال دیتا۔'' چنانچہ سب سے پہلے حضرت عثمان بن عفان کی قیادت میں سولہ اہل ایمان نصف دینار فی مسافر کرائے پر کشتی لے کر حبشہ روانہ ہوئے۔ حضرت عبد اللہ بن مخرمہ ان سولہ اصحاب میں شامل نہ تھے۔ شوال کے مہینے میں دو کشتیوں پر سوار سڑسٹھ اہل ایمان کا دوسرا قافلہ نکلا جس کی قیادت حضرت جعفر بن ابو طالب نے کی، حضرت عبد اللہ بن مخرمہ اس قافلے کا حصہ تھے۔ بنو عامر بن لؤی کے حضرت ابو سبرہ بن ابو رہم، ان کی اہلیہ حضرت ام کلثوم بنت سہیل، حضرت عبد اللہ بن سہیل، حضرت سلیط بن عمرو، حضرت سکران بن عمرو، ان کی اہلیہ حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت مالک بن زمعہ، ان کی اہلیہ حضرت عمرہ بنت سعدی، حضرت حاطب عمرو اور حضرت سعد بن خولہ ان کے ہم سفر تھے۔

حبشہ سے واپسی

مہاجرین کے حبشہ پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد قریش کے قبول اسلام کی غلط خبر پہنچی تو تینتیس اصحاب اور چھ صحابیات نے یہ کہہ کر مکہ کا رخ کیا کہ ہمارے کنبے ہی ہمیں زیادہ محبوب ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مخرمہ بھی مکہ لوٹ آئے، بنو عامر بن لؤی کے حضرت عبد اللہ بن سہیل، حضرت ابو سبرہ بن ابو رہم، ان کی اہلیہ حضرت ام کلثوم بنت سہیل، حضرت سکران بن عمرو اور ان کی اہلیہ حضرت سودہ بنت زمعہ ان کے ساتھ تھے۔

مکہ میں داخل ہونے کے بعد قریش کا تعذیب وایذا کا سلسلہ زیادہ شدت کے ساتھ دوبارہ شروع ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار دگر حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ مہاجرین کے قائد حضرت عثمان بن عفان نے کہا: ہماری ہجرت اولیٰ اور یہ ہجرت نجاشی کی جانب ہے اور آپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا: تم اللہ اور میری طرف ہجرت کر رہے ہو اور تمھیں ان دونوں ہجرتوں کا ثواب ملے گا (الطبقات الکبریٰ ۱/۱۴۱)۔

ابن سعد اسے ہجرت ثانیہ قرار دیتے ہیں، حالاں کہ ہجرت ثانیہ حضرت جعفر بن ابو طالب کی قیادت میں پہلے ہو چکی تھی۔ حبشہ سے واپس آنے کے بعد حضرت عبداللہ بن مخرمہ مکہ میں مقیم رہے۔

دوسری ہجرت، مدینہ کی طرف

بیعت عقبۂ ثانیہ میں انصار نے جان و مال کی قربانی دینے کا عہد کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر لی تو آپ نے مکہ کے ستم رسیدہ اہل ایمان کو مدینہ ہجرت کرنے کا اذن دیا۔ حضرت ابو سلمہ نے پہلے مہاجر ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان کے بعد حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت ابو احمد بن جحش اور ان کے اعزہ و اقارب دار ہجرت پہنچے، پھر حضرت عمر نے بیس افراد کا قافلہ لے کر مدینہ کا رخ کیا۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ بھی ہجرت کر کے حضرت کلثوم بن ہدم کے مہمان ہوئے۔ ان کے ساتھ حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت مقداد بن عمرو، حضرت خباب بن ارت، حضرت سہیل بن بیضا، حضرت صفوان بن بیضا، حضرت عیاض بن زہیر اور کئی اصحاب حضرت کلثوم بن ہدم کی مہمانی میں رہے۔

مواخات

ہجرت کے پانچ ماہ بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پینتالیس (یا پچاس) مہاجرین اور اسی تعداد میں انصار کو حضرت انس بن مالک کے گھر جمع کیا اور ان میں مواخات قائم فرمائی۔ آپ نے حضرت فروہ بن عمرو بیاضی کو حضرت عبداللہ بن مخرمہ کا انصاری بھائی قرار دیا۔

شاذ روایت

ابن عبدالبر کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مخرمہ کو حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت عیاش بن ابو ربیعہ اور حضرت ولید بن ولید کی طرح کفار نے مدینہ ہجرت کرنے سے روک دیا۔ حضرت سلمہ، حضرت عیاش اور حضرت ولید تو جنگ خندق سے پہلے مدینہ نہ جا سکے، تاہم حضرت عبداللہ بن مخرمہ جنگ بدر کے روز بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آن ملے (الدرر فی اختصار المغازی والسیر ۵۸)۔ ابن عبدالبر کی اس روایت کی ہمیں کسی ذریعے سے تائید نہیں مل سکی، اس لیے اسے حضرت عبداللہ بن مخرمہ کی ہجرت و مواخات کے بارے میں بیان کردہ مشہور روایت پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

اقامت

ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مخرمہ نے مدینہ کے مقام بلاط میں حضرت عبداللہ بن عوف

کے گھر کے سامنے مکان بنایا تھا۔ بلاط مسجد نبوی اور بازار کے درمیان کھلی جگہ تھی جہاں پتھر بچھا ہوا تھا (فتح الباری، رقم ۷۰۲۴۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۳۰۷۲۔ معجم البلدان ۱/۲۶۰)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں یہودی مرد اور عورت کو رجم کرایا تھا (احمد، رقم ۵۲۷۶)۔ حضرت عبداللہ بن عوف نے اس مقام کے قریب گھر بنایا جسے دار البلاط کہا جاتا تھا، حضرت عبداللہ بن مخرمہ بھی ان کے بالمقابل آن بسے۔

جنگ بدر

جنگ بدر ۱۷/ رمضان ۲ھ (۱۳/ مارچ ۶۲۴ء) میں مدینہ سے اسّی میل دور بدر کے میدان میں لڑی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں تین سو تیرہ اہل ایمان ابوجہل کے لائے ہوئے ایک ہزار کفار کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور نصرت الٰہی سے فتح عظیم حاصل کی۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ نے بھی داد شجاعت دی اور تیس سال کی عمر میں بدری ہونے کا امتیاز حاصل کیا۔

جنگ احد

جنگ احد ۱۷/ شوال ۳ھ (۲۳/ مارچ ۶۲۵ء) میں مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان جبل احد کے دامن میں ہوئی۔ تین ہزار سے زائد مشرک جنگجوؤں کی قیادت ابوسفیان کے پاس تھی۔ اس جنگ کے نتیجہ کو کسی کی فتح یا شکست نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ دونوں طرف شدید نقصان ہوا، آخر کار مشرک فوج لڑائی ترک کر کے مکہ واپس چلی گئی۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ اس غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

سریہ ابوسلمہ (سریہ قطن)

قطن بنو اسد بن خزیمہ کے پہاڑ کا نام ہے، وہاں ایک چشمہ بھی تھا۔ محرم ۴ھ میں بنو اسد بن خزیمہ کے ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ طلیحہ بن خویلد اور سلمہ بن خویلد اپنے قبیلے کے لوگوں اور حلیفوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسا رہے ہیں۔ آپ نے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد کی قیادت میں ڈیڑھ سو انصار و مہاجرین کا سریہ قطن کی طرف روانہ فرمایا۔ اس سریہ میں حضرت عبداللہ بن مخرمہ بھی شامل تھے۔ سریہ کی آمد پر بنو اسد قطن کے چشمہ پر اپنے مال مویشی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ حضرت ابوسلمہ نے ان کے مویشی دبوچ لیے، تین غلاموں کو پکڑا اور چند دنوں کے بعد مدینہ لوٹ آئے۔ جاسوسی کرنے والے اسدی کو غنیمت میں سے حصہ دیا گیا۔

بقیہ غزوات

حضرت عبد اللہ بن مخرمہ نے خندق (ذی قعد ۵ھ، مارچ ۶۲۷ء) اور خیبر (محرم ۷ھ۔ مئی ۶۲۸ء) کے غزوات میں بھی حصہ لیا۔

عہد صدیقی، شہادت

جمادی الاولیٰ ۱۲ھ (دسمبر ۶۳۲ء): حضرت عبد اللہ بن مخرمہ نے عہد صدیقی میں مدعیِ نبوت مسیلمہ کذاب کے خلاف برپا ہونے والی جنگ یمامہ میں شہادت حاصل کی۔ شوق شہادت سے سرشار ہو کر دعا کی: اے اللہ، مجھے اس وقت تک موت نہ آئے جب تک میرا بند بند تیری راہ میں زخموں سے چور چور نہ ہو جائے۔ یہ دعا قبول ہوئی، مرتدین کی سرکوبی کرتے ہوئے اس جاں فشانی سے لڑے کہ ہر عضو مجروح تھا۔

حضرت عبداللہ بن مخرمہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابوحذیفہ کے آزاد کردہ حضرت سالم رفقائے کار تھے، باری باری اپنی بکریاں چراتے تھے۔ جس دن جنگ شروع ہوئی، حضرت عبداللہ بن عمر کی باری تھی۔ وہ میدان جنگ میں پہنچے تو حضرت عبداللہ بن مخرمہ کو گرا ہوا پایا، غروب آفتاب ہو چکا تھا اور ابن مخرمہ کا آفتاب عمر بھی گہنا رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا: روزہ داروں نے روزہ افطار کر لیا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: ہاں۔ کہا: اس ڈھال میں پانی لا کر میرے منہ میں پانی ڈال دو، میں بھی روزہ کھول لوں۔ وہ پانی لے کر پہنچے تو حضرت عبداللہ بن مخرمہ دم دے چکے تھے۔ ان کی عمر ۴۱ برس ہوئی۔

جنگ یمامہ میں حضرت عبداللہ بن مخرمہ، حضرت عبداللہ بن سہیل، حضرت ابودجانہ، حضرت طفیل بن عمرو دوسی، حضرت زرارہ بن قیس اور حضرت ضرار بن ازور سمیت اٹھاون انصار و مہاجرین اور ساڑھے چار سو دیگر مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا (البدایۃ والنہایۃ، وفیات سنہ ۱۱ھ)۔ خلیفہ بن خیاط کہتے ہیں: کل ساڑھے چار سو شہدا میں سے ایک سو چالیس مہاجرین وانصار تھے (تاریخ خلیفہ بن خیاط ۱۱۱)۔

ذریت

حضرت عبد اللہ بن مخرمہ کی اہلیہ حضرت زینب بنت سراقہ کے بطن سے مساحق نے جنم لیا۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح اکلوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ کے پوتے نوفل بن مساحق اور پرپوتے سعید بن نوفل اموی دور میں زکوٰۃ کے عامل رہے۔ نوفل بن مساحق اور ان کے بیٹے عبدالملک بن نوفل سے کچھ روایات مروی

ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ کے سکڑ پوتے سعید بن سلیمان تیسرے عباسی خلیفہ مہدی باللہ کے دور حکومت میں مدینہ کے قاضی رہے۔ سعید بن سلیمان کے بیٹے عبدالجبار بن سعید حضرت عبداللہ بن مخرمہ کی نسل کے آخری فرد تھے جنھوں نے مامون الرشید کے عہد میں مدینہ کی گورنری اور پھر قضا کا منصب سنبھالا۔

مطالعۂ مزید: کتاب المغازی (واقدی)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، نسب قریش (مصعب زبیری)، انساب الاشراف (بلاذری)، جمہرۃ انساب العرب (ابن حزم)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الدرر فی اختصار المغازی والسیر (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، اصحاب بدر (قاضی سلیمان منصور پوری)۔

نقطۂ نظر

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

تفسیر ’’مفتاح القرآن‘‘ کا ایک علمی مطالعہ

(۳)

[’’نقطۂ نظر‘‘ کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

عصر حاضر کے بعض فکری تصورات پر نقد

یہ بھی اس تفسیر کی اہم علمی وفکری خصوصیت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اُس معرکۃ الآرا بحث کو پیش کرنا چاہتے ہیں جس کو صاحب تفسیر نے مختصراً اٹھایا تھا اور اب اس پر بحث جاری ہو گئی ہے، البتہ بحث کرنے والوں نے ان کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ وہ ہے یہ بحث کہ کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے؟

’استخلاف فی الارض‘ کا مطلب ہے کہ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ لے آنا اور ایک فرد کے بعد دوسرے فرد کو اس کی جگہ لے آنا۔ لفظ ’خلیفہ‘، ’استخلاف‘ اور ’خلائف‘ وغیرہ اور اس کے دوسرے مشتقات قرآن میں تقریباً ۱۵ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ اور ہر جگہ ان سے یہی معنی مراد لیے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرد یا ایک قوم کی جگہ دوسرے فرد یا قوم کو اس کی جگہ عطا کر دی۔ اکثر مفسرین کرام نے ان آیات کے مفہوم میں غلطی کی ہے۔ اور بے دلیل انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دے ڈالا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس غلط فکر کو عام کرنے میں سب سے زیادہ حصہ مولانا مودودی کا رہا ہے۔ جنھوں نے اس کو ایک پورا فلسفہ ہی بنا ڈالا ہے۔ آیت کریمہ ’اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً‘ (البقرہ ۲: ۳۰) جس کو خلافت الٰہیہ کے

علم برداروں نے اپنے فلسفہ کی اساس بنایا ہے، کی تشریح تفسیر ''مفتاح القرآن'' کی نہایت معرکۃ الآرا بحث ہے، جو بہت تفصیلی ہے۔اِس آیت کی تفسیر میں جو متعدد اقوال ہیں، مصنف علام پہلے ان کا محاکمہ کرتے ہیں، پھر نظریۂ خلافت والی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متعدد اہل علم حضرات جو خلیفہ کو اس آیت میں خلیفۃ اللہ، یعنی نائب خدا کے معنی میں سمجھتے ہیں، وہ یہاں خلیفہ سے مطلق انسان، انسان، یعنی نوع انسانی مراد لیتے ہیں اور ہمارے علم میں اس نقطۂ نظر کی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سب سے بڑھ چڑھ کر اور کافی واضح و مفصل ترجمانی فرمائی ہے۔''

آگے مولانا مودودی کی عبارت نقل کرکے اس پر نقد کیا ہے۔ اور اس آیت کی تفسیر خود مصنف علام نے یوں کی ہے:

''اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً' (ترجمہ: میں انسان کو جانشینی کے ساتھ آباد رہنے والی مخلوق کی حیثیت سے رکھنے والا ہوں)۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے طے کر لیا ہے نوع انسان نسل در نسل زمین میں آباد رہے گی یہاں 'جَاعِلٌ' کے معنی ہیں رکھنے والا 'جعل' کا رکھنے کے معنی میں استعمال معروف ہے...پس انسان ہی وہ مخلوق ہے جس میں خلافت و جانشینی کا طریقہ فطری طور پر پایا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس معنی کے لحاظ سے انسان کو خلیفہ اور انسانوں کو 'خلائف' اور 'خلفاء' کہا گیا ہے، لیکن شروع سے آخر تک قرآن کریم میں کسی جگہ بھی انسان کو 'خلیفۃ اللہ' نہیں کہا گیا ہے، حتیٰ کہ کسی نبی کے لیے بھی یہ لفظ نہیں آیا۔ داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ 'یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ' (ص ۳۸: ۲۶) (اے داؤد ہم نے تجھے اس سرزمین میں خلیفہ بنایا ہے، یعنی سلطنت میں طالوت کا اور نبوت میں حضرت شمویل علیہ السلام کا...اس کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ اے داؤد ہم نے تجھے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ جن مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے غلط کیا ہے اس ''اپنا'' کا لفظ بالکل غلط اضافہ ہے۔ اسی طرح یہاں 'اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً' کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ ''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں'' ہاں اگر 'خلیفتی' یا 'خلیفۃ لی' ہوتا تو یہ ترجمہ صحیح قرار دیا جاتا۔ اس بات کی تائید میں انھوں نے آگے حضرت ابو بکر کے اس قول کو بھی دلیل میں نقل کیا ہے جس میں انھوں نے اس شخص کی تردید کی تھی جس نے ان کو 'یا خلیفۃ اللہ' کہہ کر پکارا تھا تو آپ نے فرمایا: میں اللہ کا نہیں اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں۔[۲۴]''

۲۴۔ مزید تفصیل کے لیے، نیز اس فلسفہ کی تنقید کے لیے دیکھیے: تفسیر مفتاح القرآن، علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی (۹۱/۱-۹۴)۔ الطاف احمد اعظمی، احیاء امت اور تین دینی جماعتیں۔ پروفیسر محمد صبیح الدین انصاری، کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے،

جہاد و شوریٰ

صرف خلافت ہی نہیں، بلکہ عصر حاضر کے دوسرے مسائل پر بھی انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر جہاد اور شوریٰ کا مسئلہ۔ جہاد کے بارے میں ان کا موقف ٹھیک وہی ہے جو ہمارے فقہا کے ہاں پایا جاتا ہے، انھوں نے اس مسئلہ میں معاصر علما اور مصنفین کا موقف قبول نہیں کیا۔ اپنے خیالات کا اظہار مختلف مواقع پر کیا ہے، مثال کے طور پر آیت 'لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ' (البقرہ ۲:۲۵۶) کی تفسیر میں۔ جہاں تک شوریٰ کا معاملہ ہے تو وہ اس کے قائل ہیں کہ شوریٰ 'ملزمة' نہیں ہوتی، یعنی امیر المومنین پر شوریٰ کا اتباع واجب نہیں، البتہ ان کے لفظوں میں ''حسن سیاست کا تقاضا یہی ہے کہ امیر تاامکان کثرت رائے کے خلاف عمل نہ کرے''۔ اس موقع پر انھوں نے شوریٰ سے مروجہ جمہوریت و ڈیموکریسی کے حق میں دلیل لینے والوں پر نقد بھی کیا ہے۔[۲۵]

قراءات سبعہ

قراءات سبعہ کا مسئلہ بھی آج بحث و تمحیص کا میدان بنا ہوا ہے، مثال کے طور پر قراءتوں کے اختلاف کی روایتیں، خاص کر 'سبعة أحرف' کی بحث اور تدوین قرآن کے بارے میں یہ عام موقف کہ قرآن عہد ابو بکر میں جمع و مرتب ہوا، اسی طرح یہ قول کہ قرآن مجید کی ترتیب میں اجتہاد کو دخل ہے، نہ کہ نص کو۔ مصحف عثمانی سے عبداللہ بن مسعود کے اختلاف کی روایتیں وغیرہ۔ سب سے زیادہ کنفیوژن 'سبعة أحرف' کی تاویل پیدا کرتی ہے۔ علما کی ایک جماعت کہتی ہے کہ ہم معنی الفاظ 'اقبل'، 'هلم' اور 'تعال' میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے، 'عجل' کی جگہ 'امهل' کا استعمال بھی قرآن میں وہی معنی دے گا۔ بقول طبری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا کہ ''قرآن میں ہر طرح کے الفاظ کا استعمال درست ہے۔ بشرطیکہ تو رحمت کی جگہ عذاب اور عذاب کی جگہ رحمت کا لفظ نہ رکھ دے''۔ بات صرف اتنی ہی نہیں، بلکہ ''کنز العمال'' اور ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں اس قسم کی روایتوں اور اقوال کی کمی نہیں کہ اگر تلاوت میں اعراب کی

مکتبہ الفوزان۔ ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی، کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے؟ ایک علمی بحث، ماہنامہ التبیان دہلی نومبر ۲۰۰۷ء۔ مولانا وحید الدین خاں، تذکیر القرآن، طبع ثانی، مکتبہ الرسالہ، ۲۰۰۷ء، صفحہ ۲۵۔

۲۵۔ علامہ میرٹھی، ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن، سورۂ آل عمران، ۱/۲۵۹۔

تبدیلی کی وجہ سے معنی میں تبدیلی ہو جائے تو بھی کوئی حرج نہیں سمجھا جائے گا۔ مثلاً 'فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ' کو 'فَتُلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ'، 'وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ' (المومنون ۲۳:۸) کو 'لِاَمٰنَتِهِمْ' بصیغۂ واحد پڑھنا بھی جائز سمجھا گیا۔ الفاظ میں تقدیم وتاخیر اور حروف میں کمی بیشی بھی روا کر لی گئی۔

تاہم علامہ میرٹھی اس قسم کی کسی قراءت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ بہت سختی سے اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ موجودہ مدون مصحف کے طریقہ سے ہٹ کر قرآن کے کسی لفظ یا کلمہ کی قراءت کی جائے۔ چنانچہ 'الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ' (البقرہ ۲: ۱۸۴) کی تفسیر میں عطاء نے جو حضرت ابن عباس کی قراءت اور تفسیر یہ نقل کی ہے کہ وہ اس کو 'یطَوَّقونه' پڑھا کرتے تھے اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

"لیکن یہ تفسیر بدو وجہ واجب الرد ہے (الف) اگر عطاء کا بیان صحیح ہے اور فی الواقع حضرت ابن عباس اس آیت میں 'یطوقونه' پڑھا کرتے تھے تو یہ ٹھیک نہ تھا، کیونکہ قرآن کریم کی عبارت وکلمات میں قیاس آرائی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن کریم بطریق تواتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور بلاشبہ آپ نے 'یطیقونه' ہی پڑھا پڑھایا ہے، یہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تلقین فرمایا تھا، اور نقل متواتر کے خلاف کسی کو بھی قرآن کریم کا کوئی لفظ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ عطاء کو حضرت ابن عباس کے متعلق یہ بات نقل کرنے میں وہم ہو گیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کلمۂ قرآن کی حیثیت سے نہیں، بلکہ تفسیر مطلب واظہار معنی کی غرض سے 'یطیقونه' کو 'یطوقونه' سے تعبیر کر دیا ہوگا۔[26]"

مزید یہ کہ آیت کریمہ 'وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ' کی ان کی تفسیر بھی معرکۃ الآرا ہے اور تمام متقدمین ومتاخرین سے الگ ہٹ کر ہے اور نہایت مدلل ومستحکم رائے پر مبنی ہے، جو یوں ہے:

ترجمہ: اور اُن بیماروں اور مسافروں پر فدیہ یعنی ایک مسکین کا کھانا لازم ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مریض ومسافر اگر اتنی مالی استطاعت رکھتا ہو کہ ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے تو اس پر قضا بھی لازم ہے اور فدیہ بھی اور اگر اتنی استعاعت نہ رکھتا ہو تو اس پر صرف قضا واجب ہے فدیہ نہیں۔[27]

اس کے بعد علامہ نے آیت کریمہ کی تفسیر سلف وخلف سے منقول اقوال اور روایوں کا محکم دلائل کے ساتھ

۲۶۔ مفتاح القرآن ۱/۳۶۶۔

۲۷۔ مفتاح القرآن ۱/۳۶۸۔

محاکمہ کیا ہے۔ جو مطالعہ کے قابل ہے۔[۲۸]

لغوی تحقیقات

عربی زبان کے قواعد و لسانی اصول یوں تو سماعی ہیں، مگر بعض جگہوں پر علامہ نے ان میں بھی اجتہاد سے کام لیا ہے اور متقدمین سے اختلاف کیا ہے، مثال کے طور پر سورۂ ہود کی آیت 'یَوۡمَ یَاۡتِ لَا تَکَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ۚ فَمِنۡہُمۡ شَقِیٌّ وَّسَعِیۡدٌ' (۱۱: ۱۰۵) جس وقت روز آخرت آدھمکے گا اس حال میں کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص بات نہ کرے گا۔ تو کچھ لوگ تو بدبخت ہوں گے، یعنی کفار اور کچھ خوش نصیب ہوں گے، یعنی مومنین۔

اس پر تنبیہات کے تحت لکھتے ہیں: 'یوم یاتِ' حذف 'یا' کے ساتھ ہی ثابت ہے۔ بعض قراء نے یہ خیال کر کے اسے 'یاتی' پڑھا ہے کہ یہاں کوئی جزم کرنے والا حرف یا اسم نہیں ہے اور دیگر آیات قرآنیہ میں 'یاء' قطعاً ثابت ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود کے پہلے رکوع میں ہے 'اَلَا یَوۡمَ یَاۡتِیۡہِمۡ لَیۡسَ مَصۡرُوۡفًا عَنۡہُمۡ' (۱۱: ۸) اور سورۂ نحل میں ہے 'یَوۡمَ تَاۡتِیۡ کُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِہَا' (۱۶: ۱۱۱) اور بھی جگہ جس فعل مضارع پر لفظ 'یوم' قرآن میں آیا ہے تو وہ فعل مرفوع ہی ہے جیسے 'یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ' (المائدہ ۵: ۱۰۹)، 'یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُہُمۡ' (المائدہ ۵: ۱۱۹)، اس لیے یہاں بھی مرفوع ہونا چاہیے، مگر اس کے متعلق ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ:

'والصواب من القرائة فی ذلک عندی یومَ یأتِ بحذف الیاء فی الوصل والوقف اتباعًا لخط المصحف' یعنی چونکہ مصحف عثمانی میں 'یأتِ' لکھا ہوا ہے نہ کہ 'یأتی' اس لیے اسے حذف 'یاء' کے ساتھ پڑھنا ہی درست ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ 'یاء' کس قانون کے تحت حذف ہوئی ہے؟ اس کا جواب ابن جریر وغیرہ نے یہ دیا ہے کہ یہ قبیلۂ ہذیل کے محاورہ کے مطابق ہے۔ یہ قبیلہ حالت جزم کی طرح حالت رفع میں بھی مضارع منقوص کے آخر سے حرف علت گرا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ 'لا ادری' کی جگہ 'لا ادرِ' بولتے ہیں۔ ابن جریر لکھتے ہیں "انهالغة معروفة لهذيل تقول ما اَدرِ ما تقول ومنه قول الشاعر'

كفاك كف ما تلبق درهما

جودا واخرى تعطِ بالسيف الدما

۲۸۔ مفتاح القرآن ۱/ ۳۶۵-۳۷۰۔

(اصل میں 'تعطی' تھا، 'ی' گرا دی گئی۔)

(میرے فیاض وصف شکن ممدوح) تیرے دو ہاتھ (محاسن) ہیں ایک بزم یاراں میں جود وسخا اور انفاق درہم و دینار کے باعث تہی کف رہتا ہے، جب کہ دوسرا رزم حق و باطل میں شمشیر بکف اور خوں ریز ہے۔ (ترجمہ مصنف مقالہ کا ہے)

لیکن میرا دل اس توجیہ کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ مضارع منقوص سے بحالت رفع بھی حذف حرف علت فصیح ہوتا تو دیگر مواضع میں بھی 'یوم یاتِ' اور 'یوم تاتِ' فرمایا جاتا۔ پھر قرآن کریم جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے، لغت قریش پر نازل ہوا ہے۔ اور معلوم ہے کہ حضرت عثمان نے نقل مصاحف کے وقت اس حقیقت کا بڑا لحاظ و اہتمام فرمایا تھا۔ میرے نزدیک اس کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ 'متٰی' کی طرح 'یوم' بھی اسم ظرف ہے اور جیسے 'متٰی' شرط کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے جیسے 'متی تذهب اذهب' اسی طرح 'یوم' بھی شرط کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے، جیسے 'یومَ تسافر أُسافر' (جس دن تو سفر کرے گا میں بھی سفر کروں گا) اگر 'متٰی' محض ظرف کے معنی میں آئے، شرط کے معنی میں نہ ہو تو اس کے بعد آنے والا فعل مضارع مرفوع ہوتا ہے جیسے تم کسی سے پوچھو 'متٰی تذهب' (تو کب جائے گا؟) یہ ہی حکم 'یوم' کا ہے کہ وہ شرط کے معنی سے مجرد ہو تو اس کے بعد آنے والا فعل مضارع مجزوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جب 'یوم' شرط کے معنی دے تو وہ بھی جازم ہو گا جیسے 'یومَ تذهب أذهب' پس 'یومَ یاتِ' اس آیت میں اس لیے ہے کہ لفظ 'یوم' یہاں معناً شرط کے معنی کا فائدہ دے رہا ہے۔ 'یومَ یاتِ' شرط ہے اور 'فمنهم شقی وسعید' اس کی جزا ہے اور بیچ میں 'لا تکلم نفس إلا بإذنه' حال ہے''۔[۲۹]

عبادت و اطاعت میں جوہری فرق

بانی جماعت اسلامی مولانا مودودی نے اپنے نظریہ کی تشریح کے لیے ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' لکھی اور اس میں عبادت و اطاعت، دونوں اصطلاحوں کو لغات کی مدد سے قریب قریب ایک ہی بنا دیا۔ سید قطب شہید بھی اس سلسلہ میں انھی کے خوشہ چیں ہیں، اگرچہ مشہور اخوانی رہنما حسن الہضیبی نے اس سے اختلاف کیا ہے، جماعت اسلامی کے اہل علم عام طور پر مولانا مودودی کی اتباع ہی کرتے ہیں۔ مولانا کی اس رائے سے

۲۹؎ تفسیر مفتاح القرآن، تفسیر سورۂ ہود، ۱۵۰/۳۔

متعدد اہم علم (مثال کے طور پر مولانا علی میاں ندوی، مولانا منظور احمد نعمانی اور مولانا وحید الدین خاں) نے اختلاف کیا ہے۔ جن میں سے علامہ میرٹھی بھی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ''مفتاح القرآن'' میں تفصیل سے اس پر کلام کیا ہے کہ عبادت اور طاعت میں جوہری و اساسی فرق ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

''عبادت، پرستش یا پوجا اس اختیاری عمل کو کہتے ہیں جو کسی فوق البشری طاقت کی حامل ہستی کو خوش کرنے کے لیے انجام دیا جائے، عبادت کا اصل مفہوم تو یہی ہے البتہ کبھی کبھی مجازاً لفظ عبادت کو اطاعت کے معنی میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے، مثلاً شیر کا اطلاق انسان پر مجازاً کر دیا جاتا ہے۔ اطاعت کسی صاحب اقتدار و با اختیار ہستی کے حکم کو ماننا اور اس کی رضا چاہنا ہے۔ یہ دونوں معنی آپس میں نہ متضاد ہیں نہ متلازم۔ اس لیے ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اور افتراق بھی۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی عمل عبادت و طاعت دونوں ہو، اور یہ بھی کہ کوئی عمل اطاعت ہو، عبادت نہ ہو۔ مثال کے طور پر فرض نماز عبادت بھی ہے اطاعت بھی مگر نفل نماز عبادت ہے اطاعت نہیں، کہ اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا۔ اسی طرح چور کا ہاتھ کاٹنا یا زانی کو سزا دینا اطاعت ہے مگر وہ عبادتی عمل نہیں۔ اسی طرح مجازاً یہ کہا جاتا ہے کہ مومن کا ہر کام عبادت ہے۔ حالاں کہ عبادت اور اطاعت میں جوہری فرق ہے۔ وہ یوں کہ اسلام میں عبادت صرف خدا کا حق ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، اس دین کی بنیاد ہی اِس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معبود سمجھا جائے۔ اس میں اللہ کے علاوہ کسی اور کی خواہ وہ مقرب فرشتہ ہو یا نبی و رسول عبادت کرنا اکبر الکبائر اور گناہ عظیم ہے۔ جب کہ اطاعت کے معاملہ میں نسبتہً وسعت ہے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ہی رسول کی اطاعت بھی فرض ہوتی ہے اور اولوالامر کی مشروط اطاعت کا بھی حکم ہے۔''[30]

'وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ' (البقرہ ۲: ۱۰۲) میں 'ما' کو مصدریہ مان کر عام طور پر یہ ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں کہ ہاروت و ماروت نامی دو فرشتے تھے جن کو اللہ نے جادو کا علم دے کر آزمایش کے لیے زمین پر بھیجا تھا۔ مگر اشکال یہ ہے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ سحر بھی منزل من اللہ اور حق ہو، اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی لوگوں کو سحر کی تعلیم دینے کا انتظام فرمایا ہو، حالاں کہ سحر کو اللہ تعالیٰ نے کفر بتایا ہے۔ اس ناقابل حل اشکال کے باعث علامہ میرٹھی نے 'ما' کو نافیہ مان کر یہ ترجمہ و تشریح کی ہے: اور نہ ہی بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر جادو اتارا گیا ہے، (پس یہ بھی ان شیاطین کی دروغ بافی ہے) اصل بات یہ ہے کہ سرزمین بابل میں جو کہ صدیوں سے ویران و غیر آباد پڑی تھی دو جادوگروں نے اپنی کُٹی بنا رکھی

۳۰؎ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن، سورہ الفاتحہ، ۱/ ۳۲۔

تھی۔...اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں عبرانی نسل کے تھے، کیونکہ اس انداز کے نام اسی نسل میں ملتے ہیں...ہاروت وماروت نامی ان جادوگروں نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کی طرح ویرانہ نشینی اختیار کر کے اپنی شخصیت کو پراسرار بنا رکھا تھا۔...وہ کسی خام طلب شخص کو منہ نہ لگاتے، بلکہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے جسے طلب کا سچا پاتے اسے ہی بتاتے۔[۳۱]''

'لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم'

اسی طرح غزوۂ بدر کے سلسلہ میں آیت کریمہ 'لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ' (الانفال ۸: ۶۸) (اگر اللہ کی طرف سے ایک حکم نہ ہوتا جو پہلے ہی صادر ہو چکا ہے تو یقیناً اس مال غنیمت کی وجہ سے جو تم نے لیا ہے تم پر عذاب آپڑتا) کے بارے میں جو عام تفسیر ہے وہ یہ کہ غزوۂ بدر میں مکہ کے ستر مشرک قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا اس پر عتاب کے بطور یہ آیت نازل ہوئی۔

اس کی تشریح علامہ نے یوں کی ہے کہ: ''چونکہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی طے فرما چکا ہے کہ امت محمدیہ کے مجاہدین کو شکست خوردہ کفار کا مال لینا جائز و حلال ہے، اس لیے اس جنگ میں جو اموال غنیمت تم نے حاصل کیے ہیں انھیں تمھارے حق میں جائز رکھا گیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سابق نہ ہوتا تو تمھارا یہ پوری طرح قابو پا لینے کے باوجود کفار کی اچھی طرح خونریزی سے گریز کر کے اموال غنیمت جمع کرنے پر ٹوٹ پڑنا اللہ کی نعمت کی ناقدری اور متاع دنیا کی طرف رغبت کے معنی میں ہونے کی وجہ سے ایسی سخت بات تھی کہ اس کی وجہ سے تم عذاب عظیم کی گرفت میں آجاتے۔ خیر تمھاری یہ غلطی معاف کر دی گئی، لہٰذا خمس نکالنے کے بعد جو مال غنیمت تمھیں حصہ میں ملا ہے، اسے شوق سے اپنے تصرف میں لاؤ''۔ اِس کے بعد اس آیت کریمہ کے سلسلہ میں مشہور عام تفسیر پر یوں نقد کرتے ہیں:

''مفسرین سے بعض روایات کی وجہ سے ان آیات کا صحیح مطلب سمجھنے میں چوک ہو گئی ہے۔ انھوں نے یہ سمجھا سمجھایا ہے کہ غزوۂ بدر میں جو ستر کفار گرفتار ہوئے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر وغیرہ کے مشورہ سے فدیہ لے کر رہا کر دیا تھا تو ان آیات میں اسی پر عتاب کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان قیدیوں کو مار ڈالنا ہی اولی وانسب تھا نہ کہ فدیہ لے کر چھوڑ دینا۔ لیکن حضرات مفسرین نے اگر کماحقہٗ ان آیات پر غور کیا ہوتا اور ان روایات کو بھی پرکھا ہوتا تو اس غلط فہمی میں نہ پڑتے''۔[۳۲]

۳۱؎ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن، سورہ الفاتحہ، ۱/ ۲۲۴-۲۲۷۔

۳۲؎ ملاحظہ ہو: مفتاح القرآن، سورۂ انفال، ۲/ ۶۳۶۔

مفسرین ایک روایت یہ بیان کرتے ہیں کہ ان قیدیوں کے متعلق وحی الٰہی نے مسلمانوں کو اختیار دیا تھا کہ ''چاہو تو انھیں قتل کر دو چاہو تو فدیہ لے کر چھوڑ دو، لیکن چھوڑو گے تو آئندہ سال تم میں سے ستر آدمی شہید ہوں گے، صحابہ نے اسی کو ترجیح دی''۔ اس بارے میں علامہ کا کہنا ہے کہ یہ کوئی حدیث نہیں، بلکہ واقدی اور سدی جیسے افسانہ طراز راویوں کی افسانہ طرازی ہے۔ امام بخاری تو کیا امام مسلم نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اختیار دیا ہوتا تو فدیہ لینے پر عتاب کیوں ہوتا اور اسے عذاب عظیم کا سزاوار کیوں قرار دیا جاتا؟ کیونکہ جب کسی کو دو کاموں کا اختیار دیا جائے کہ ''خواہ یہ کر خواہ وہ کر تو وہ ان دو شقوں میں سے جو شق بھی اختیار کرے بہر حال لائق ملامت نہیں ہوتا۔[۳۳]'' اس کے بعد صحیح مسلم کی ایک متعلق روایت کو بھی زیر نقد لائے ہیں، جس پر بحث تفصیلی ہے اور تین صفحات تک چلی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ سے متعلق ترمذی کی روایت کردہ روایتوں پر بھی مفصل نقد کیا ہے۔[۳۴]

فاسق سے حضرت ولید مراد نہیں

اسی طرح آیت کریمہ 'اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ' (الحجرات ۴۹: ۶) میں بہت سارے مفسرین نے فاسق سے مراد حضرت ولید بن عقبہ کو لیا ہے جو عمال عثمان میں اہم شخصیت تھے، اور جن پر حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان، تینوں خلفا نے اعتماد کیا اور اہم مناصب پر فائز رکھا۔ مگر خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان کو بطور خاص باغیوں نے اور امت کے بہت سے علما نے ولید کو کوفہ کی امارت دینے پر ظالمانہ طور پر مطعون کیا ہے۔ مفسر گرامی نے اس سورہ کی تفسیر میں ان تمام روایات کا تفصیل سے ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور سب کو موضوع ثابت کر کے حضرت ولید اموی کی شخصیت کو داغ دار کرنے والے قصہ کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں، جس کو ہمارے مفسرین نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں۔[۳۵]

[باقی]

۳۳۔ مفتاح القرآن ۲/ ۶۳۷۔

۳۴۔ مفتاح القرآن ۲/ ۶۳۸۔

۳۵۔ ملاحظہ ہو: تفسیر مفتاح القرآن، سورۂ حجرات، مسودہ صفحہ ۵۵۳ تا ۵۶۱۔

نقطۂ نظر

ڈاکٹر عدیل احمد

صوفیت اور نجات

زیرنظر مضمون بالخصوص ان افراد کے لیے لکھا گیا ہے جو نجات کے لیے کسی ایک دین کی اتباع کو ضروری نہیں گردانتے اور انسان کے لیے انسان کی محبت، اور ایک عمومی بھائی چارے اور امن وسلامتی کے فروغ کو ہی انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ اس مضمون کے عنوان کے انتخاب میں ہم نے ایک جسارت بھی کی ہے، یعنی ایک نئی اصطلاح، 'صوفیت' کا استعمال۔ یہ کوئی مروجہ اصطلاح نہیں ہے، لیکن ایک تو اپنے اس مضمون میں جس خیال اور جس رویے کو دین اسلام سے ممیز کرنے کے لیے ہم اپنی معروضات پیش کریں گے، اس کے احاطے کے لیے، ہم اعتراف کریں گے کہ ہمیں اس سے بہتر لفظ نہیں سوجھا، اور دوسرے ہم بہرحال اسے تصوف کے ساتھ بھی خلط مبحث نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ تصوف کیا ہے، اور کسی بھی دین کے ساتھ اس کا رشتہ کس نوعیت کا ہے، وہ کس قدر ضروری یا غیر ضروری ہے؟ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جاوید احمد غامدی صاحب کا طویل مضمون ''اسلام اور تصوف'' (مطبوعہ المورد۔ ۱۹۹۵ء) اس بارے میں ہمارے خیالات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ لہٰذا فی الوقت ہم اس پر گفتگو کو قطعی ضروری نہیں سمجھتے۔ جس رویے کو ہم یہاں 'صوفیت' کے نام سے زیر بحث لا رہے ہیں، اس پر البتہ ہماری محدود معلومات کے مطابق کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا ہے اور اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تصوف کے حامی تصوف کو کسی بھی دین کی روح سمجھتے ہیں، وہاں ایک اچھا خاصا طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جو کسی ایک دین کے دائرے میں شامل ہونا اور کچھ لگے بندھے ضابطوں، قوانین اور ارکان کی پابندی کرنا ضروری نہیں جانتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے کچھ تو ہمت کر کے خود کو صوفی کہہ دیتے ہیں، باقی کی اکثریت

انسان دوست، انسانیت کو ماننے والا یا ہیومینیٹیرین (Humanitarian) کہلانا پسند کرتی ہے۔ جو بات انھیں دہریوں سے الگ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آخر الذکر کے بر خلاف یہ ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ یوں مذاہب کو بھی مانتے ہیں، بلکہ ان مذاہب کو بھی تسلیم کرتے ہیں جنھیں عام طور پر آفاقی یا افلاکی نہیں سمجھا جاتا۔ بسا اوقات تو یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے ان مذاہب کو زیادہ مانتے ہیں، لیکن کسی بھی دین پر یقین رکھنا یا اس کی پیروی کرنا ان کے نزدیک نجات کے لیے لازمی شرط نہیں ہے۔

بہت مناسب ہے کہ اسی مقام پر مضمون کے عنوان میں سے 'نجات' کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ ہم نے یہاں یہ لفظ 'فلاح' یا 'کامیابی'، خصوصاً اخروی کامیابی کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے استعمال کیا ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک ان معنوں میں یہ لفظ اپنے ہم معنی الفاظ سے زیادہ موزونیت کا حامل ہے اور دوسرے اس طرح ہم اس وحشت کو بھی کم سے کم سطح پر رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے ان قارئین کو جن کا ذکر ہم نے صوفیت کے حوالے سے کیا ہے، ممکنہ طور پر ان تمام اصطلاحات سے ہوتی ہے جو کسی طور 'اسلامی' ہونے کا تاثر رکھتی ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ہمارے یہ دوست جن کے عقیدے کی وضاحت کے لیے ہم صوفیت کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں، خود کو کسی ایک مذہب کے دائرے میں قید رکھنا پسند نہیں کرتے، رچیوئلز (rituals) اور مذہبی رسوم کی ادائیگی ضروری نہیں گردانتے، بالخصوص انسان سے، اور بالعموم ہر ذی روح سے محبت کو اپنا خاصا جانتے ہیں، اور اسی محبت کو اصل میں خدا کی لافانی محبت اور رضا حاصل کر لینے کی کنجی سمجھتے ہیں۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ کی درجہ بندی اگرچہ دینی حوالے سے بھی کی جاتی ہے اور عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے حقوق تو اللہ معاف کر دے گا، لیکن حقوق العباد نہیں بخشے گا، لہٰذا ان کا پورا کرنا ترجیحاً زیادہ ضروری ہے، تاہم ہمارے یہ ''انسان دوست'' ساتھی منہ سے کہہ دینے کی حد تک گو اس جملے سے کلی اتفاق کرتے ہوں، لیکن در حقیقت حقوق اللہ ان کے ہاں دوسرے درجے کی ترجیح بھی نہیں ہیں۔ اللہ یا کسی ایک خالق کے تصور سے انھیں انکار نہیں ہے، یا کم از کم اس شدت سے انکار نہیں ہے جو دہریوں کے ہاں پائی جاتی ہے، لیکن رسولوں کو وہ صرف اچھے انسان، عظیم رہنما اور مصلحین سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کا احترام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ خیر اور شر کی کائناتی قدریں ابتداے آفرینش سے ہی موجود ہیں اور ان کے نزدیک ان کی پہچان کے لیے کسی پیغام یا ان پر عمل کے لیے کسی شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ان کا ماننا ہے کہ حقوق و فرائض کا احساس انسان کے اندر ازل ہی سے قائم ہے اور تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شعوری سطح پر اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔

ان میں سے جو لوگ قرآن کریم کے مطالعے سے مشرف ہیں، وہ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۲[1] کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو کسی بھی مذہب، ملت یا دین کے فرق سے بلا لحاظ، بلکہ کفر، شرک، اور ایمان، الحاد کی تقسیم سے بھی ماورا، سب لوگوں کو معاف کر دے اور اس عام معافی کے لیے کوئی بھی شرط عائد نہ کرے۔ اس امکان کا اظہار ہم صرف اپنی خوش فہمی کے نتیجے میں نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس کے لیے بھی قرآن کریم ہی کی ایک آیت پیش کر سکتے ہیں جو در حقیقت مجھ جیسے خطا کاروں اور بد عملوں کے لیے سب سے بڑا سہارا ہے۔[2] لیکن یہاں دو نکات قابل وضاحت ہیں: ایک تو اول الذکر آیۂ مبارکہ کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے، جو در حقیقت بالکل سادہ اور آسان ہے۔ قرآن کریم ہی میں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے (آل عمران ۳: ۱۹)، یعنی لوگ اپنے طور پر اس پیغام کو چاہے جو بھی نام دے لیں اور خود کو یہودی، نصرانی، یا صابی کچھ بھی کہلوائیں، ان کے خالق کی طرف سے توحید، اعمال صالح اور آخرت پر ایمان کا بنیادی پیغام ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جو مختلف زمانوں میں، مختلف علاقوں میں مختلف پیغمبر لاتے رہے ہیں۔ اب اگر کوئی ان اساسی عناصر پر یقین رکھتا ہو اور اس کی زندگی اسی یقین کی روشنی میں بسر ہو تو اس کا بدلہ اس کے رب کے ہاں موجود ہے اور اسے کسی رنج یا خوف کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور یہ پالیسی بیان دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کوئی استثنیٰ نہیں دیا، بلکہ سب سے پہلے انھی کا ذکر کیا ہے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس پیغام کو سچے دل سے مان لینے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کوئی شخص، وہ چاہے یہودی، عیسائی یا کسی بھی ایسے خود ساختہ گروہ سے متعلق ہو، اس پیغام کو پا لینے کے بعد خود کو ان سے علیحدہ کر کے صرف اور صرف اسی ایک دین سے جڑ جائے گا جس کے لیے اس کے خالق نے اسلام کا نام پسند کیا ہے اور جو اصل میں تحریف اور آلایش سے پاک تمام ادیان کی صحیح شکل ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، اگر ضمنی طور پر اس ایک آیت میں موجود پیغام کی جامعیت پر ایک دو جملے

۱۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور وہ جو یہودی ہوئے، اور عیسائی اور صابی، تو جو بھی ان میں سے اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھے اور نیک کام کرتا رہے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کسی طرح کا غم۔

۲۔ سورۂ زمر آیت نمبر ۵۳: کہہ دیجیے کہ اے میرے وہ بندو جو اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے ہو، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو جانا۔ بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخشنے والا ہے، وہ تو ہے ہی معاف کر دینے والا مہربان۔

عرض کر دیے جائیں۔ ان تین اجزا میں جو اس آیۂ مبارکہ کا حصہ ہیں، ہدایت کا ایک جہان ہے۔ پہلی شرط توحید کی ہے، جو اپنے دامن میں خالق کے ساتھ تعارف، عبودیت اور خالق کی طرف سے مخلوق کی رہنمائی کے مکمل سلسلے پر یقین کا تقاضا لیے ہوئے ہے۔ دوسرا جز نیک اعمال سے متعلق ہے، جو فرد اور سماج کی نمو اور ارتقا کے ضامن ہیں اور پھر آخرت کا ذکر ہے، جو احتساب کا ایک بے مثال احساس پیدا کرتا ہے۔ اگر غور کریں تو یہی وہ تین باتیں ہیں جو ایک انسان یا ایک معاشرے کی متوازن زندگی کے لیے اساس فراہم کرتی ہیں۔ کسی معاشرے میں نہ تو تربیت کے بغیر محض قانون کے نفاذ سے انصاف، امن اور سلامتی کا ماحول برقرار رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی قانون کی منصفانہ عمل داری کے بغیر فقط تزکیہ اور تربیت کے سہارے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے اولین دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی اجزا پر بالترتیب کام کر کے ایک مثالی معاشرے کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس آیۂ مبارکہ کے تین اجزا جہاں ایک فرد کے لیے نجات کا فارمولا فراہم کرتے ہیں، وہیں اگر ایک دوسرے زاویے سے غور کیا جائے تو مجموعی بھلائی کے لیے بھی یہی تینوں اجزا بالترتیب پہلے توحید کے ذریعے سے دلوں کے تزکیے اور تقویٰ کا اہتمام کرتے ہیں، پھر اعمال صالحہ کی تربیت اور ترغیب کا ذکر ہے کہ ایک مثالی معاشرے کا قیام عمل میں آئے اور پھر اس کے بعد احتساب اور جزا و سزا کے ساتھ اس قائم کیے گئے نظام کی بقا کو یقینی بنایا گیا ہے۔

وہ تمام لوگ جو سخت سزاؤں کے خلاف ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی ارتقا کے اس موڑ پر سزا برائے تادیب شاید اب ایک فرسودہ رسم ہو گئی ہے اور یہ مقصد فقط تربیت اور اصلاح سے پورا ہونا چاہیے، اور ہمارے صوفیت پسند دوستوں کی ایک بڑی تعداد ان میں شامل ہے، اس معاملے میں مسئلے کا صرف ایک رخ دیکھتے ہیں۔ یوں تو کسی بھی معاملے کے تمام پہلوؤں پر وقت کے کسی ایک حصے میں پوری نگاہ رکھنا کسی بھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ مثال کے لیے ہم انسانی حقوق ہی کو لے لیتے ہیں، اس لیے بھی کہ ایک تو یہ موضوع ہمارے مضمون کے عنوان سے سیدھا تعلق رکھتا ہے، کیونکہ صوفیت پسند، انسانیت کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانیت کو اگر موجود آفاقی مذاہب کے متوازی ایک علیحدہ مذہب ہی مان لیا جائے تو انسانی حقوق سے بہتر اس مذہب کی کتاب (شریعت) کیا ہو گی۔ اور دوسرے بظاہر انسان کے بنائے ہوئے دوسرے تمام قوانین، معاہدوں، چارٹرز (Charters) اور پالیسیز (Policies) کی نسبت انسانی حقوق کی دستاویز ایک بڑے عام فہم اور آسان اصول پر مبنی ہے، یعنی ایک فرد کو انتخاب اور عمل کے لیے ہر طرح کی آزادی ہے، جب تک کہ اس کی

وجہ سے کسی دوسرے فرد کو نقصان نہ پہنچے۔ خیر یہ فائدہ و نقصان بھی نسبتی معاملات ہیں، لیکن ان پر بحث ہمارے مضمون سے دور جا پڑے گی۔ ہم بتانا یہ چاہ رہے ہیں کہ انسانی حقوق جیسے بظاہر سیدھے سادے اور سمجھ میں آنے والے معاملے میں بھی ایسی پیچیدگیاں موجود ہیں کہ اگر ہم غور کرنے بیٹھ جائیں تو آخر کار یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہو گا کہ انسانی حقوق کا فیصلہ بہر حال انسان کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اپنے اس خیال کی تائید کے لیے ہم نہایت اختصار کے ساتھ صرف ایک مثال کا تذکرہ کریں گے۔ اپنی جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت، اپنے اختیار کا مظاہرہ، اپنے لیے لباس کا انتخاب آپ کا حق ہے، لیکن اس نمود و نمایش سے کسی دوسرے شخص کے جذبات اور احساسات میں جو اشتعال، برانگیختگی یا محرومی پیدا ہوتی ہے، اسے انسانی حقوق کی کوئی شق خطاب نہیں کرتی۔ اس کے لیے بہر حال آپ کو دین ہی کا دامن پکڑنا پڑتا ہے۔ اور اس مثال کو معمولی مت سمجھیے گا۔ مغربی معاشروں میں زیادہ اور اب بد قسمتی سے ہمارے ہاں بھی ہونے والے اکثر جرائم کی بنیاد انھی مجروح اور مشتعل جذبات و احساسات پر رکھی جا سکتی ہے۔

اگر ہم خدا کو نہیں مانتے تو یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ الوہیت اور الحاد کی بحث کے لیے ہمارا مضمون، ''دین یا لادینیت: ایک عقلی جائزہ'' (مطبوعہ اشراق، جولائی ۲۰۱۴ء) دیکھیے۔ لیکن اگر ہم خدا کو مانتے ہیں اور مختلف ادوار میں اس کے بھیجے ہوئے پیغامات کی حقانیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن فقط انسان کی محبت کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیتے ہیں اور خالق کی طرف سے آئے ہوئے پیغام کو سمجھنے یا اس کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرنے کو اپنی نجات کے لیے ضروری نہیں گردانتے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم خالق سے بڑھ کر اس کی مخلوق کے ساتھ محبت نہیں کر سکتے۔ درحقیقت محبت ہے ہی وہ جو اللہ اپنی تخلیق، اپنی مخلوق کے ساتھ کرتا ہے۔ ہمارے دلوں میں جو احساس پایا جاتا ہے، وہ تو اصل میں اس لافانی محبت کا پرتو ہے اور گو بظاہر ہماری یہ محبت کتنی ہی خالص اور بے غرض ہو، جب وقت اور حالات کے امتحان سے گزرتی ہے اور علم اور آگہی کی روشنی جس قدر اس پر پڑتی ہے، اس کے کھوٹ، اس کی آلایشیں اور اس کی ناپایداری اسی قدر واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم وقت کے ایک خاص حصے میں رہتے ہوئے اور واقعات اور حالات کے صرف ایک ٹکڑے پر ایک مخصوص زاویے سے نظر ڈالتے ہوئے کسی مجرم سے نمٹتے ہوئے ایک قانون کو بے رحم قرار دے سکتے ہیں، لیکن ہماری رائے تبھی درست کہلائے گی جب یا تو ہم اس جرم سے خود براہ راست متاثر ہوئے ہوں اور یا پھر اس پوری تصویر کا ہی حصہ نہ ہوں، بلکہ کینوس سے آزاد ہو کر اسے دیکھ رہے ہوں، جو ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہم تخلیق ہیں۔ کائنات

کے اس وسیع کینویس پر اس عظیم منظر نامے کا، جسے المصور نے بنایا ہے، کوئی ایک جز ہیں، جو بظاہر اس بڑی تصویر کے کسی دوسرے حصے سے جس قدر بھی دور اور لاتعلق نظر آتا ہو، بہر حال اس کا ایک حصہ ہے۔

اس مضمون کے لکھنے سے ہمارا مقصد ہر گز یہ نہیں ہے کہ اپنا تمام زور بیان یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیں کہ وہ سب لوگ جو ہمارے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتے یا خاص طور پر کسی ایک مروجہ الوہی دین کے بجائے صوفیت (یا انسانیت) کے قائل ہیں، جہنم کے کندے ہیں۔ ہم اللہ کی رحمت سے نہ اپنے لیے اور نہ ہی دوسروں کے لیے ناامید ہیں اور اس سلسلے میں پہلے ہی اپنی راے کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہاں، جس راستے کو، البتہ ہم سب سے زیادہ محفوظ اور یقینی سمجھتے ہیں، اس کی طرف بلانا ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔

اسے ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔ فرض کیجیے، آپ لاہور سے راولپنڈی کے لیے عازم سفر ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آپ پوری تیاری کرتے ہیں۔ سامان سفر باندھتے ہیں۔ گاڑی میں پیٹرول ڈلواتے ہیں۔ اس کا تیل پانی بھی پورا کرتے ہیں، اور دیگر امور جیسے ٹائروں کی ہوا وغیرہ کے بارے میں بھی اپنی تسلی کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ مناسب رقم بھی رکھ لیتے ہیں کہ سفر میں ضرورت پڑنے پر کام آئے۔ اس تمام تیاری کے بعد آپ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتے کہ سمت کے بارے میں معلوم کریں یا راستہ سمجھیں۔ نہ آپ کے پاس رہنمائی کے لیے کوئی نقشہ ہے، نہ آپ کسی سے پوچھتے ہیں اور نہ جی پی آر ایس (GPRS) وغیرہ سے مدد لیتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ کسی خاص سمت کی یا کسی مخصوص راستے پر چلنے کی ضرورت نہیں ہے، بس چونکہ آپ کی نیت ٹھیک ہے، تیاری مکمل ہے اور سفر کا سامان بھی پورا ہے، لہٰذا آپ منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ بہر حال اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ اس طرح بھی آپ آخر کار راولپنڈی پہنچ ہی جائیں، لیکن زیادہ خدشہ اس بات کا ہے کہ آپ کبھی اپنی منزل پر نہ پہنچ سکیں۔ پھر آخر اس میں کیا حرج ہے کہ جس نے آپ کو لاہور سے راولپنڈی بلایا ہے، اس نے دعوت نامے کے ساتھ رہنمائی کے لیے جو نقشہ بھیجا ہے، اس سے مدد لی جائے۔

یہاں ایک اور سوال پوچھا جاتا ہے کہ صرف اسلام ہی کیوں اور آخر باقی مذاہب کیوں نہیں؟ اس سوال کا جزوی جواب تو ہم اسی مضمون میں پیچھے کہیں دے چکے ہیں۔ اصل میں ہر مذہب اسلام ہی ہے۔ یا یوں کہیے کہ دین صرف ایک ہی ہے: اسلام۔ خالق نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے جو پیغام بھیجا ہے، آپ اسے جو بھی نام دے دیں، مختلف اوقات میں پیغام لانے والوں کے ناموں پر اسے یہودیت کہہ لیں، عیسائیت کہیں یا کچھ اور،

اللہ نے اس کے لیے ’اسلام‘ کا نام پسند کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے اس بنیادی پیغام میں جو تحریفات اور آمیزشیں کیں، ان کی درستی کے لیے یہ پیغام ہر زمانے میں تطہیر کے ایک عمل سے گزرا۔ لوگوں نے تطہیر اور درستی کے اس عمل کو ہی اس کی پہچان بنا لیا، ورنہ پیغام بھیجنے والا بھی وہی ہے اور پیغام بھی۔ خالق کی طرف سے آنے والے اس ہدایت نامے کی آخری تطہیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی اور اس کے نتیجے میں اس کا وہی اصل نام بحال کر دیا گیا جو خالق نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ انسان کی عمومی عقل اس سے تقاضا کرتی ہے کہ اگر وہ یہ مان لیتا ہے کہ اس کے خالق نے اس کے لیے کوئی ہدایت نامہ بھیجا ہے تو یقیناً وہ اس کے آخری اور حتمی متن کو قبول کرے گا۔

صوفیت پسندوں کی طرف سے ایک خوب صورت اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان ابدی پیغامات کا بنیادی مقصد تو صرف ایک پرامن، خوش حال اور مبنی بر انصاف معاشرے کا قیام ہے اور ان کی اساس تو درحقیقت محبت اور سلامتی ہی ہے، پھر اگر کسی خاص مذہب کو مانے بغیر انسان اپنے تمدن کے ارتقا میں اپنی غلطیوں، تجربوں اور تاریخ سے سیکھ کر اس طرح کا معاشرہ قائم کر لیتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مذہب کے عقائد و نظریات کا بھی پیروکار ہو اور اس کے رسوم و آداب پر بھی عامل ہو؟ اس سوال کا جواب دو حصوں پر مشتمل ہے:

اولاً، یہ کہ امن و سلامتی، محبت اور انصاف گو اس پیغام کے انتہائی اہم اور بے حد ضروری جز ہیں، لیکن اس کا بنیادی مقصد مخلوق کی خالق سے پہچان کرانا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ انسان کے شعور کے کسی نہاں خانے میں خالق نے اپنی ہستی کا جو احساس رکھ دیا ہے، یہ پیغام اصلاً اس کی یاددہانی ہے۔ اس یاددہانی اور اس کے قیام و تسلسل کے لیے ہمارا خالق ہم سے اگر کچھ عبادات و اعمال اپنانے کے لیے کہتا ہے تو ضروری نہیں کہ ان کی ساری کی ساری منطق اور توجیہ ہم ایک ساتھ، اور فوراً ہی سمجھ جائیں۔ یوں بھی اس دنیا میں اپنے اردگرد کارفرما عوامل میں سے کتنے ہیں جنھیں ہم ابھی تک مکمل طور پر سمجھ سکے ہیں۔ ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اخلاص اور عمل کو سنوارتے ہوئے ان فرائض پر کاربند رہیں۔ امید ہے کہ ان کے فوائد اور ان کی ضرورت بھی رفتہ رفتہ ہم پر واضح ہوتی چلی جائے گی۔

ثانیاً، یہ کہ اسی ہدایت نامے پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ معاشرے میں انصاف، محبت، ہم دردی اور رواداری کا فروغ ہو گا۔ بلکہ ہم تو کہیں گے کہ صحیح معنوں میں ایک مثالی معاشرہ قائم ہی تب ہو سکتا ہے جب لوگ اس الوہی پیغام کو دل و جان سے تسلیم کر لیں، ورنہ بھلا بتائیے، خود احتسابی، جزا اور سزا، نیکی اور ثواب اور

پوچھ گچھ کا ایسا مکمل خیال اور کون سا نظام پیش کرتا ہے۔ پھر تاریخ ہمیں جہاں وہ نمونے دکھاتی ہے جب کبھی معاشرے نے اس پیغام کو اپنا حرز جاں بنا کر جرم و جبر میں حیرت انگیز کمی کی ہے تو کہیں کمیونزم کے جبر اور کہیں سامراجی نظام کے استحصال کی مثالیں بھی پیش کرتی ہے، جب انسان نے اس پیغام کو فراموش کر کے خود اپنی عقل کی رہنمائی میں ارتقا کا یہ سفر طے کرنا چاہا ہے۔ اس راستے پر ہمیشہ ادھورے علم، لالچ، خواہش اور مفاد طلبی کی دھند چھائی رہی ہے۔

وہ تمام مذاہب جو آج اس دنیا میں کسی بھی شکل میں موجود ہیں، یہ سوچ کر ان کا احترام کرنا کہ عین ممکن ہے وہ اپنے وقت کے خالص دین اسلام کے طور پر ہی رب کائنات کی طرف سے اتارے گئے ہوں، اور ان میں سے خاص طور پر ان ادیان کے من جانب حق تعالیٰ ہونے کا یقین رکھنا، جن کا ذکر اسی دین اسلام کی آخری کتاب میں موجود ہے، بہر حال ایمان کے بنیادی شرائط میں شامل ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے یہ 'صوفیت' زدہ دوست جس فراخیِ قلب کے ساتھ ہر طرح کے مسلک، مذہب اور عقائد کے مجموعوں کو چاہے وہ کیسے ہی دور از کار کیوں نہ ہوں، محض اپنی انسان دوستی اور انسانیت کے احترام کی بدولت گلے سے لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں، وہ لائق تحسین ہے۔ یہاں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گلے سے لگانے سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی مذہب کے دائرے میں عملی طور پر داخل ہو جائیں، بلکہ دل چسپ بات یہ ہے کہ مستند اور مقبول آفاقی مذاہب کے لیے ان کا یہ احترام اور یہ محبت بتدریج کم ہوتے ہوتے اس سلسلے کے آخری دین کے لیے فقط برائے نام ہی رہ جاتے ہیں اور جس قدر کوئی عملی طور پر ان مذاہب کا پیرو ہو گا، اسی قدر وہ ان کی اس ہمہ گیر محبت اور احترام کے لیے استحقاق کھو دے گا۔

ایک متعلقہ نکتے کی وضاحت یہاں بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کسی کا احترام کرنا اور کسی پر یقین لے آنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ آپ کسی کی بات نہ مانیں، لیکن بہر حال اس کی راے کا احترام کریں اور اس کی شخصیت سے محبت بھی کریں اور اس کی عزت بھی کرتے رہیں، لیکن کسی کی بات کو مان لینے کا مطلب بہر حال یہی ہے کہ اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے۔ ایک دین اپنے اندر ہمیشہ ایک دعوت لیے ہوتا ہے اور جب آپ اسے برحق تسلیم کرتے ہیں تو درحقیقت آپ کے پاس اب اس دعوت کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ ممکن ہے کہ آپ ایک دین کو درست مان لینے کے بعد، یعنی اس پر ایمان لے آنے کے باوجود اس کے چند شرائط پر عمل پیرا نہ ہو پائیں، اس صورت میں آپ بے عمل کہلائیں گے اور اگر اس کے کچھ احکام کی صریح خلاف ورزی

کریں تو گناہ گار، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ایک دین کو سچ تسلیم کریں اور پھر ساتھ ہی ساتھ اس کے احکام بجالانا ضروری بھی نہ سمجھیں۔ اس صورت میں آپ کا یہ ایمان زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہیں، جسے کوئی چاہے تو مصلحت پسندی قرار دے، لیکن اسلام اس کے لیے منافقت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

اس طرح کی صورت حال، آج کل اصل میں نفاق سے زیادہ لاعلمی کی مرہون منت ہے۔ انسانی حقوق کی تکرار اور انسانیت نوازی کے چڑھتے سورج کے رعب نے ہم میں سے بہت سوں کو ان حقوق و فرائض اور ان سے متعلق قواعد و ضوابط کے منبع سے ہی بے نیاز کر دیا ہے۔ اور یوں کسی بھی دین کے مطالعے کے بغیر، اس کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کیے بنا، ہی فقط انسانی حقوق اور انسانیت کے نام پر اسے تسلیم کر لینا بھی تقریباً ایسا ہی ہے جیسا کہ اسی انداز میں اسے مسترد کر دینا۔ در حقیقت کسی دین کو درست مان لینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم اسی کو نجات کا واحد راستہ مان رہے ہیں۔ ہم یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ قواعد و ضوابط کی یہ دستاویز اسی ہستی کی جانب سے ہے جو ہمارا اور تمام جہانوں کا خالق ہے۔ اس صورت میں، ظاہر ہے کہ کامیابی کے لیے جو روڈ میپ اس دین میں موجود ہے، وہ ہمیں اور کہاں دستیاب ہو گا۔ اور خاص طور پر جب اس کا اصرار بھی ہے کہ اس ایک راستے کے سوا باقی تمام گذر گاہیں باطل ہیں۔

اب رہ گیا یہ معاملہ کہ جب سبھی ادیان درست ہیں، آفاقی ہیں اور اسی ایک خالق کی جانب سے ہیں تو پھر کیا ضروری ہے کہ کسی ایک کو ہی اپنا ضابطۂ حیات تصور کیا جائے اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ سب کو برحق تسلیم بھی کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کے سوا باقی سب کو مسترد بھی کر دیا جائے۔ اس بظاہر مشکل گتھی کا حل بڑا سادہ سا ہے۔ اس معمے کی کلید یہ حقیقت مان لینے میں ہے کہ یہ بہت سارے مختلف مذاہب نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی دین کے مختلف ایڈیشنز ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے میں رہنمائی کے لیے تازہ ترین ایڈیشن ہی پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

صاحب زادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی

مولانا امین احسن اصلاحی کے بارے میں شدید غلط بیانی

[ماہنامہ ''اشراق'' میں محمد بلال صاحب کا مضمون ''حیات امین احسن'' کے نام سے قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس مضمون پر صاحب زادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی صاحب نے زیر نظر مضمون میں نقد کیا ہے۔ ان صفحات میں بگوی صاحب کا مضمون اور اس نقد پر بلال صاحب کا جواب قارئین کے استفادے کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)]

ایک صاحب مولانا امین احسن اصلاحی کی زندگی کے حالات قلم بند کر رہے ہیں۔ ان کی زیر ترتیب کتاب کا نام ''حیات امین احسن'' ہے۔ اصولی طور پر عنوان میں مولانا کا پورا نام آنا چاہیے، ادھورا نام نامناسب ہے۔ اس سلسلے میں ماہنامہ ''اشراق'' لاہور میں مسٹر محمد بلال کا ایک سلسلۂ مضامین جاری ہے، جس کی ایک قسط (نومبر ۲۰۲۳ء) ہمارے سامنے ہے۔ مرتب نے مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴ء - ۱۹۹۷ء) کے حالات زندگی کے بارے میں ابھی تک صرف مختلف ذرائع سے لیے ہوئے اقتباسات پر اتفاق کیا ہے اور جہاں کسی امر کی وضاحت یا غلط بات کی تردید کی ضرورت تھی، اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ کتاب کا مرتب ان الزامات سے متفق ہے جو کسی دوسرے مبصر یا مرتب نے مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھ دیے ہیں یا مرتب اپنی کم علمی کے باعث ان الزامات کی کاٹ اور ان کے منفی اثرات سے بے خبر ہے۔

ماہنامہ ''اشراق'' لاہور مشہور اسکالر جاوید احمد غامدی صاحب کا سرکاری ترجمان رسالہ ہے، جس کو ان کی تنظیم ''المورد'' شائع کرتی ہے۔ اس میں غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' اور ان کے شاگردوں اور

خوشہ چینوں کی تخلیقات اور نگارشات شائع کی جاتی ہیں، گو بعض تحریروں سے ادارہ متعلق ہونے کی حامی نہیں بھرتا۔

کسی بھی شخصیت پر لکھتے ہوئے پہلے اس کے بارے میں دستیاب تمام لٹریچر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان تحریروں میں عام طور پر ظاہر ہے۔ شخصیت کے حسن و قبح یا اس کی اچھائی برائی کا ضرور ذکر کیا جاتا ہے۔ اچھی بات کی تحسین کے ساتھ اس خوشگوار پہلو کو مزید مدلل کیا جاتا ہے اور کسی اعتراض یا تنقیص پر تنقید اور مخالفت کے لیے دلائل فراہم کیے جاتے ہیں، مگر جہاں باتیں سرے سے حقائق کے منافی ہوں یا غلط مفروضات اور بے بنیاد خیالات کو الزامات کا بہروپ دیا جائے، وہاں ان کا ابطال بہت ضروری ہوتا ہے۔ بصورت دیگر وہ غلط مفروضہ یا بے بنیاد الزام Repeat ہو کر مستقل عنوان قرار پاتا ہے، خاص طور پر جب ایک مخالف کو کسی دوسرے کی عیب جوئی مطلوب ہو۔

مضمون کے صفحہ نمبر ۳۹ پر محمد بلال صاحب نے ایک کتاب کا اقتباس شائع کیا ہے۔ ''ذکر فراہی'' کے نام سے اس کتاب میں تحقیق کی آڑ میں یہ الزام مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ ہی کے ایک فارغ التحصیل طالب علم اور شاگرد شرف الدین اصلاحی نے عائد کیا تھا، جو ''ذکر فراہی'' کے مرتب و مؤلف ہیں۔ اس کتاب کے صفحات ۸۴۰ ہیں اور اس کو سن ۲۰۰۱ء میں دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے اعظم گڑھ ہندوستان نے شائع کیا تھا۔[1] ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی[2] بنیادی طور پر کچھ صحافی تھے اور کچھ محقق۔ بظاہر دونوں شعبوں کے ساتھ ان کا اتنا گہرا تعلق نہیں ہے، مگر اس کتاب میں ان کی سنسنی خیزی اور اجنبی انکشافات بطور صحافی زیادہ نمایاں ہیں! جس نے بھی شرف الدین صاحب کا تذکرہ دیکھا ہے تو وہ یہ بات بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ ان کے دل میں مولانا اصلاحی کے بارے میں گہرا بغض بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک مفروضہ قائم کیا ہوا ہے جس کے تحت انھوں نے

۱۔ ''ذکر فراہی'' کے نام سے کتاب کا ایک ایڈیشن لاہور پاکستان سے بھی شائع ہوا ہے۔ اس نسخے میں ڈاکٹر اصلاحی کے مفروضہ اتہامات سے کلی صرف نظر کیا گیا ہے اور صرف مصدقہ امور کو اجاگر کیا ہے۔ (اب)

۲۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ایک سیلانی الطبع اور غیر مستقل مزاج انسان تھے۔ ایک عرصہ معروف صحافی مولانا اصلاحی کے فرزند اکبر جناب ابو صالح اصلاحی مرحوم کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان کی سفارش پر پھر مشہور ناول نگار نسیم حجازی کے ذریعے سے روزنامہ ''کوہستان''، راولپنڈی میں کام کرتے رہے، مگر جلد اکتا گئے۔ طویل عرصہ وہ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور کے بانی کے گھر مستقل مہمان رہے۔ بظاہر بے خانماں زندگی گزاری۔

مولانا اصلاحی کے علمی اور تفسیری کام کو بیٹا اور دو نمبر قرار دینا ہے۔ چنانچہ ان کا جھکاؤ برابر اس بات کی طرف رہتا ہے کہ وہ مولانا اصلاحی کی خدمات کو کم تر دکھائیں۔ وہ قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ”تدبر قرآن“ اور دیگر علمی خدمات میں مولانا اصلاحی کا حصہ بس ایک نقال اور رپورٹر جیسا ہے۔ مولانا نے اپنی محنت سے اور اپنی فکر سے اپنے استاذ کے علمی کارناموں میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا، البتہ اتنے شان دار علمی کام کا کریڈٹ اکیلے خود لے لیا ہے۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں دائرۂ حمیدیہ مولانا اصلاحی کے واپس نہ جانے کی وجہ سے پنپ نہ سکا۔ وہاں کے لوگ مولانا فراہی پر کچھ قابل ذکر کام نہ کر سکے تو یہ بھی مولانا اصلاحی کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر ”تدبر قرآن“ میں مولانا فراہی کے مرتبے، ان کے اعلیٰ نظریات اور ان کی شان دار خدمات کا اعتراف جس اعلیٰ ظرفی سے کیا اور بار بار اپنے استاذ کو خراج تحسین پیش کیا ہے، وہ اصل کام کی بات تھی اور یہ اعتراف کتاب کے دیباچے سے لے کر تفسیر ”تدبر قرآن“ کی مختلف سورتوں کی تشریح میں جگہ جگہ بڑے واشگاف اور شان دار الفاظ میں ملتا ہے۔ مولانا اصلاحی تکرار اور اصرار سے اپنے استاذ مولانا فراہی کی عظمت اور ان کے علم، تقویٰ اور فراست و حکمت کو خراج عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مولانا فراہی کے حالات زندگی میں جس عقیدت، محبت اور ہیرو ورشپ کا اظہار کیا ہے وہ کمال اعتراف و تحسین ہے!

ڈاکٹر شریف الدین اپنے خبث باطن اور دل کی بیماری کو ایک اور لبادے میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا فراہی کے زیر مطالعہ قرآن مجید کے نسخے جن پر مولانا فراہی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے حاشیے اور نوٹس موجود ہیں، وہ مولانا اصلاحی کے پاس تھے اور وہ مدرسۃ الاصلاح کی ملکیت تھے۔ ایک طرف ڈاکٹر شرف الدین یہ فرماتے ہیں کہ مولانا فراہی کے سارے مسودات واپس چلے گئے تھے، مگر مولانا فراہی کے حاشیے والے دونوں قرآن واپس کرنے سے مولانا اصلاحی نے انکار کر دیا۔ بدلحاظی اور بدنیتی کی اسی رو میں ڈاکٹر اصلاحی مزید شک کرتے ہیں کہ بقول بدر الدین اصلاحی مرحوم، کچھ عربی مسودات بھی واپس نہیں کیے گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شرف الدین نے مزید زبانی کلامی الزامات لکھے ہیں اور مولانا اصلاحی کے کام کی قدر و قیمت کو گھٹانے کی شعوری کوشش کی اور ان کی اعلیٰ شخصیت پر گرد اڑانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے الفاظ الہامی ہوں اور انھیں کسی سند یا ثبوت کی ضرورت نہ ہو۔ اتنی بڑی شخصیت کے خلاف بے پر کی بات کہنے کے لیے شاید شرف الدین صاحب کے پاس بڑا منہ ہو گا، لیکن کوئی دلیل، کوئی ثبوت، کوئی گواہ، کسی خط کا اشارہ

کچھ ذکر نہیں کیا۔ جو من میں آیا اسے بے دھڑک اگل دیا۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان میں حال ہی میں چند نادان دوستوں نے مولانا فراہی کے حواشی قرآن کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے[۳]۔ اس پر میں نے ایک تبصرہ تحریر کیا ہے، جو جریدہ ''شمس الاسلام'' بھیرہ میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر عبید اللہ فراہی کی اس کاوش میں اہل علم کے لیے کوئی رہنمائی یا کسی دل چسپی کا سامان موجود نہیں ہے، بلکہ ان نوٹس کو شائع کر کے نادان دوستوں نے فکر فراہی کے گرد مزید دھول اڑائی ہے۔ وہ فکر پہلے بھی گنے چنے لوگوں کی دل چسپی کا مرکز تھا، نامکمل اور تشنہ نوٹس، بلکہ غیر مربوط اشارے ان کے افکار کو مزید گنجلک اور لاینحل بنا دیں گے ؟

یہ نوٹس تو کسی عربی دان عالم فاضل کی سمجھ سے بھی باہر ہیں، چہ جائیکہ ان سے کوئی طالب علم استفادہ کر سکے۔

خدا معلوم ڈاکٹر شرف الدین کن حواشی کا ماتم کر رہے ہیں جن کو وہ خود بھی نہ پڑھ سکیں اور نہ سمجھ سکیں۔

اگر قرآن پر حواشی واپس نہیں گئے تو ڈاکٹر عبید اللہ فراہی نے کہاں سے حاصل کیے اور پھر ہندوستان سے شائع کر دیے؟

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ''ذکر فراہی'' میں ایک اور در فتنی نکالتے ہیں کہ مولانا اصلاحی نے مولانا فراہی کے مطبوعہ اجزاے تفسیر (عربی) کو اردو میں ترجمہ کیا تو کہیں کہیں ترجمے میں کمی بیشی کر دی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا اصلاحی نے بہت پہلے اس بات کی خود وضاحت کر دی تھی کہ ترجمے میں ان کے حک و ترمیم سے کوئی ترمیم مقصود نہ تھی، بلکہ اس کی مدد سے عبارت کے اصل مقصد کو مزید واضح کرنا تھا جو مولانا کے نزدیک بالکل ناتمام یادداشتوں کی شکل میں تھے اور ان کو کھولنا یا سمجھنا بہت دشوار تھا۔

ایک انتہائی فاضل اور مزاج شناس شاگرد اگر توضیح کے لیے ایسا کرتا ہے اور پھر اس کی وضاحت بھی کرتا ہے تو اس میں غلط بات کیا ہے؟

ایک اور در فتنی میں ڈاکٹر شرف الدین ۵۰ ہزار روپے کے ایک خطیر عطیے کا ذکر کرتے ہیں، جو مولانا فراہی کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر حفیظ اللہ نے دائرۂ حمیدیہ کے لیے مولانا اصلاحی کے نام بصورت چیک دیے تھے تاکہ مولانا فراہی کے نامکمل کاموں اور علمی مسودوں کو شائع کیا جائے۔ یہ بات مولانا اصلاحی سے تب کہی جا رہی ہے

۳۔ ''امام فراہی کے قرآنی حواشی''، مرتبہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی، تصحیح: مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی، مطبوعہ: مکتبہ حزب الانصار بھیرہ پاکستان۔ (اا ب)

جب وہ اقامت دین کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پٹھان کوٹ میں جماعت اسلامی کی تعمیر میں مصروف تھے۔ یہاں شرف الدین صاحب پھر اپنی فطری نیش زنی سے باز نہیں آئے اور کلیم کیا کہ ان کے ہم نوالہ، بلکہ ہم نوا بدرالدین اصلاحی صاحب نے مولانا اصلاحی کو جب مولانا فراہی کے مسودات کی اشاعت کی جانب توجہ دلائی تو مولانا اصلاحی نے جواب دیا:

''مولانا فراہی کے مسودات کی اشاعت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ ان کو سمجھے گا کون[۴] (ایک تو عربی اور وہ بھی مولانا فراہی کے اشارے) بہتر ہوگا کہ ان کے افکار کو سامنے رکھ کر اردو میں نئے سرے سے ایک تفسیر لکھی جائے۔[۵]''

اس کے بعد بقول ڈاکٹر شرف الدین، بدرالدین صاحب اس جواب پر حد درجہ افسردہ اور مایوس ہوئے، گویا ''فاضل محقق'' کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مولانا اصلاحی کو اپنی نام وری اور شہرت زیادہ عزیز تھی، ان کے لیے مولانا فراہی کا نام، پہچان اور قدر و منزلت ثانوی تھا۔ ثبوت کے لیے شرف الدین صاحب کو پھر خط نہ مل سکا!

مولانا اصلاحی کی ہدایات کی روشنی میں ان کے شاگرد رشید جناب خالد مسعود مرحوم نے مولانا فراہی کے متعدد مسودات کو اردو میں ترجمہ کیا اور افادۂ عام کے لیے سہ ماہی ''تدبر'' لاہور میں باقاعدگی سے شائع کرتے رہے۔ پاکستان میں یہ مقصد مولانا اصلاحی کی زیر نگرانی بہت احسن طریقے سے سرانجام پاتا رہا۔ ترجمہ شدہ مقالات کتابی شکل میں دستیاب ہیں۔

ایک اور جگہ شریف الدین صاحب جماعت اسلامی کے حلقوں میں نظم و ربط آیات کی تفہیم کے حوالے سے اپنی پخ لگاتے ہیں:

''اعیان واکابر یہ کہتے کہ اصلاحی صاحب نظم کی جو باتیں کرتے ہیں وہ زیادہ تر کھینچا تانی ہوتی ہے (اور اہل) ان کے مخاطب اپنی دینی اور علمی سطح کے لحاظ سے اس کے اہل نہیں تھے۔''

ڈاکٹر شرف الدین کے خبث باطن کی آگ ان بے بنیاد الزامات سے ٹھنڈی نہیں ہو پائی اور وہ آگے بڑھے اور مولانا اصلاحی سے لاہور میں ان کے ساتھ ملاقات میں کہیں ''دائرۂ حمیدیہ'' ہندوستان کی علمی وراثت کا ذکر

۴۔ حواشی قرآن کو دیکھ کر مولانا اصلاحی کی بات بہت معقول اور مفید دکھائی دیتی ہے۔ (اا ب)

۵۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے ۵۳ سال کی طویل تحقیق اور مطالعے کے بعد فکر فراہی کی روشنی میں شان دار تفسیر ''تدبر قرآن'' لکھی جو ۹ جلدوں میں دستیاب ہے۔ مطبع فاران پبلی کیشنز لاہور۔

کیا جب بدر الدین اصلاحی وفات پا چکے تھے۔ گویا ہندوستان میں واقع مدرسۃ الاصلاح اور دائرۂ حمیدیہ کے حالات سے بے خبر اور لاتعلق ہونے کے باوجود مولانا اصلاحی پاکستان سے از خود مداخلت کریں اور وہاں کے حالات میں فیصلے صادر کریں۔ چنانچہ اس تجویز کے جواب میں اور اپنی علمی وراثت کے لیے مولانا اصلاحی نے اس موقع پر اپنے شاگرد رشید خالد مسعود کا نام لیا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ فکر فراہی و اصلاحی کے لیے برصغیر پاک و ہند میں ان کے وارث خالد مسعود ہوں گے۔ اس مسکت جواب کے بعد ڈاکٹر شرف الدین صاحب ذرا ٹھٹکے، مگر رکے نہیں۔

اب اضافہ شک والزام کے لیے ڈاکٹر شرف الدین کی توجہ کسی بکس کی جانب مبذول ہوتی ہے جو بقول ان کے ابھی تک مولانا اصلاحی کے کمرے میں ہے۔ لاہور ڈیفنس میں جب مولانا حیات تھے، مگر شدید بیمار تھے۔ شرف الدین صاحب مولانا کی شدید علالت کی حالت میں پھر دو نسخوں کا ذکر کرتے ہیں، جس کے بارے میں مولانا اصلاحی کے عزیز ترین، قریب ترین اور قابل ترین شاگرد خالد مسعود صاحب بھی لاعلم تھے۔ ڈاکٹر شرف الدین کے بقول مولانا اصلاحی کے داماد انجینئر نعمان علی مرحوم نے بتایا کہ وہ نسخے محفوظ ہیں اور وہ بکس مولانا اصلاحی کے کمرے میں ان کی چار پائی کے نیچے دھرا ہے!

اول تو نعمان علی مرحوم کوئی علمی شخصیت نہ تھے اور نہ ہی عربی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ دوسرے وہ اتنے غیر ذمہ دار بھی نہ تھے کہ مسودات کو جستی ٹرنک میں ڈال کر چار پائی کے نیچے رکھ دیتے! جیسے یہ کوئی خزانہ ہو اور اس کی حفاظت اس پر بیٹھ کر کی جا سکتی ہے!

حیرت ہے کہ قرآن کا طالب علم قرآن کے نسخوں پر اپنے استاد کے حواشی کو ایک صندوق میں ڈال کر شدید علالت میں بھی اپنی چار پائی کے نیچے رکھتا ہے اور کسی کو بھی ان نسخوں کی اہمیت اور برکت کا اتا پتا نہیں ہے، جب کہ مولانا خود شدید ڈیمنشیا میں مبتلا تھے۔

اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ہندوستان سے مولانا فراہی کے پوتے ڈاکٹر عبید اللہ فراہی نے نسخہ ہائے قرآن پر حواشی سے ایک کتاب کیسے مرتب کی اور پھر اسے شائع کر لیا؟

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اس قبیل کے محقق تھے جو ایک منفی سوچ اور ایک طے شدہ مخالف بیانیے کے ساتھ ہندوستان پاکستان میں لوگوں سے ملتے رہے۔ ان سے اپنے مطلب کی بات کہلواتے اور بلا سند و ثبوت آگے اپنی غرض کے لیے Quote کرتے رہے۔ کرید کرید کر اختلافی ایشوز ڈھونڈتے رہے، بے پر کی اڑانے کے لیے ہوائی تیر چلاتے رہے۔ مفروضہ فائلیں اور جگہ جگہ کا غذات کھنگالتے رہے۔ ان کا واحد مقصد عیب جوئی تھا، وہ

مولانا احسن اختر اصلاحی کی معصومیت، حق تلفی اور ثانوی حیثیت تھی یا مولانا امین احسن اصلاحی کی تنگ مزاجی، علمی وجاہت اور خودستایش کا بہانہ، مگر خوش قسمتی سے انھیں کوئی ایسی بات ملی یا سند حاصل نہ ہو سکی جس سے وہ مولانا اصلاحی پر کسی علمی بد دیانتی یا اپنے استاذ کے ساتھ بد عہدی یا کسی پرانے رفیق کے ساتھ زیادتی کا ثبوت دے سکتے۔ ڈاکٹر شرف الدین کے تمام تر مفروضے بے بنیاد اور سب اتہامات غلط ثابت ہوئے۔ اتفاق سے انھوں نے جو سب سے صحیح بات لکھی، وہ مولانا اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ”مولانا فراہی ایک سر مخفی تھے، میں نے انہیں آشکار کیا... میں نے ایک دھیلا خرچ کیے بغیر وہ کام کر دیا جس کے لیے ڈاکٹر حفیظ اللہ نے پچاس ہزار کا عطیہ دیا تھا۔ اب انھیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ میں نے کچھ نہ کیا اور روز حشر مجھے ان سے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا... یہ (اکیسویں) فراہی صدی ہے۔“

(ذکر فراہی ۵۸۲)

محمد بلال

”مولانا امین احسن اصلاحی کے بارے میں شدید غلط بیانی“ کے جواب میں

تنقید ایک نعمت ہے۔ اس سے مسائل کے مخفی پہلو اجاگر ہوتے، حقائق نکھر کر سامنے آتے، جس سے بہتر رائے قائم کرنے میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تعمیری تنقید میں کسی چیز کی خوبیوں اور خامیوں، دونوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے، مگر مذہبی لوگ جب کسی بات پر تنقید کرتے ہیں تو انھیں اس کے اندر جو خامیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ بالعموم ان تک ہی محدود رہتے، بلکہ بسا اوقات بات کرنے والے کی ذات کو بھی اپنا ہدف بنا لیتے ہیں۔

عقل عام کا تقاضا ہے کہ کسی کتاب پر تنقید کرنے سے قبل پہلے اسے پورا پڑھا جائے، خاص طور پر اس کا دیباچہ، جس میں مصنف کتاب لکھنے کا بنیادی مقصد واضح کرتا ہے۔ اس کے علاوہ قارئین کو پیشگی طور پر کچھ اہم امور سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ سیاق وسباق کو نظر کرنا ہی ہے جس کے باعث ہمارے ہاں ایک قرآن کو ماننے کے باوجود اتنے فرقے بن گئے، جن کے باہمی ”علمی“ دنگل صدیوں سے جاری ہیں اور نتیجے کے طور پر بے شمار لوگ مذہب اور مذہبی پیشواؤں سے بے زار ہو رہے ہیں۔ کاش! ناقد محترم صاحب زادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی نے راقم کی اس کتاب کا دیباچہ پڑھنے کی زحمت فرمائی ہوتی تو انھیں میری کتاب کے حوالے سے یہ تحریر لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ دیباچے میں یہ لکھا گیا تھا کہ:

> ”امین احسن کہا کرتے تھے کہ عام آدمی خلاصہ پسند ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں اختصار کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اس پہلو سے یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اس کتاب کی زبان آسان ترین اور بول چال کے قریب ترین ہو۔

اور پھر یہ بے قراری بھی ہے کہ لوگوں کی امین احسن کی اصل شخصیت سے ناواقفیت کو ختم کرنے کا جلد از جلد کوئی اہتمام ہو، اس لیے فی الحال مختصر اور عمومی کتاب کو ترجیح دی ہے۔‘‘

راقم نے ’’حیات امین احسن‘‘ ۱۸ برس میں نہیں، بلکہ ۸ ماہ میں لکھی تھی۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے حوالے سے جو بحثیں بگوی صاحب کی تنقیدی تحریر میں کی گئی ہیں، میری ان کے اندر دل چسپی نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ اسی لیے اس کتاب کو مرتب کرتے وقت انھیں موضوع نہیں بنایا گیا تھا۔ دیباچہ واضح ہے کہ میرے پیش نظر مولانا کے کام اور شخصیت کا بنیادی اور مختصر تعارف جلد از جلد کرانا مقصود تھا۔ میرا مخاطب عام آدمی تھا اور بقول مولانا امین احسن ’’عام آدمی خلاصہ پسند ہوتا ہے۔‘‘ اور میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ عام آدمی علما کے اس نوعیت کے جھگڑوں سے بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ دین کے علم برداروں سے ایسے رویوں کی توقع نہیں رکھتا۔ بہر حال راقم تو چونکہ ’’مسٹر‘‘ قسم کا آدمی ہے، اس لیے بہتر ہے کوئی مذہبی متقی پرہیز گار عالم فاضل ہستی ایسی بحثوں کے بارے میں تحقیق کرے اور اپنی رائے پیش کرے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ڈاکٹر شرف الدین کے نقل کیے گئے جس اقتباس پر بگوی صاحب نے تنقید کی بنیاد رکھی ہے، وہ ’’حیات امین احسن‘‘ میں ’’فراہی کی تقلید‘‘ کے ذیلی عنوان کے تحت درج کیا گیا تھا۔ اور ڈاکٹر شرف الدین کا اقتباس نقل کرنے سے قبل یہ بھی لکھا گیا تھا: ’’اور جب امین احسن نے تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ مکمل کر کے اس امانت کا حق ادا کیا تو ان کے جذبات کا عالم کیا تھا؟ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں:‘‘ یعنی یہاں اصل موضوعات ’’فراہی کی تقلید‘‘ اور ’’تدبر قرآن‘‘ کی تکمیل پر مولانا امین احسن اصلاحی کے جذبات کا بیان ہے۔ چنانچہ اس اقتباس میں ضمنی یا جزوی طور پر جو کچھ دوسری باتیں بیان ہوئی ہیں، ان کی حیثیت میرے نزدیک ثانوی ہے۔

بگوی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ ’’مرتب نے مولانا امین احسن اصلاحی کے حالات زندگی کے بارے میں ابھی تک صرف مختلف ذرائع سے لیے اقتباسات پر اتفاق کیا ہے اور جہاں کسی امر کی وضاحت یا غلط بات کی تردید کی ضرورت تھی، اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس سے بظاہر گمان ہوتا ہے کہ کتاب کا مرتب ان الزامات سے متفق ہے۔‘‘

حیرت ہوتی ہے بگوی صاحب، ’’تدبر قرآن‘‘ کے مفسر کے ساتھ اپنا تعلق بھی ظاہر کر رہے ہیں اور بدگمانی بھی کر رہے ہیں۔ وہ تو اس معاملے میں بہت حساس تھے۔ راقم نے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کا یہ اقتباس دیباچے ہی میں نقل کر دیا تھا کہ ’’یہ کتاب موجودہ حالت میں خامیوں سے بھری ہوئی ہے۔‘‘

لٰہٰذا ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی کتاب سے جہاں جہاں بھی اقتباسات نقل کیے گئے، دیباچے میں اصولی طور پر ان میں غلطی کا امکان تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور اس حقیقت سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کے سوا کوئی کتاب اور انبیاے کرام کے سوا کوئی انسان غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ اقتباس کو نقل کرتے وقت میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ امام فراہی نے اپنے فکر کا ''امین'' مولانا امین احسن کو قرار دیا تھا، اس لیے ان کے مسودات کے اصل مالک مولانا امین احسن ہی قرار پاتے ہیں۔ اگر انھوں نے کچھ مسودات استفادے کے لیے اپنے پاس رکھ لیے تو یہ ان کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ بگوی صاحب ڈاکٹر شرف الدین کی کتاب سے اس ضمن میں مزید حوالے دے کر اپنی بات کو میرے درج کیے گئے اقتباس کے دائرے سے باہر لے آئے ہیں، جس پر اب ڈاکٹر شرف الدین کے حلقے کی جانب سے وضاحت آنی چاہیے، کیونکہ انھی لوگوں کے پاس ان معاملات کی براہ راست معلومات ہوں گی۔

راقم نے کسی بھی شخصیت پر یہ پہلی کتاب مرتب کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مولانا اور ان کے کام سے بہت متاثر ہے۔ اس لیے مولانا امین احسن اور ڈاکٹر شرف الدین کے مابین جب بھی کوئی اختلاف ہو گا تو اس کا فطری جھکاؤ مولانا امین احسن کی طرف ہو گا، مگر اس کے باوجود وہ اپنی رائے دلیل کی بنیاد پر قائم کرے گا، لیکن بگوی صاحب نے اسی موقع پر ہی اسے مولانا امین احسن کے بر خلاف نقطۂ نظر کا حامی قرار دے ڈالا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی باتوں پر اب حیرت نہیں ہوتی، اس لیے کہ ایسی باتیں ہماری مذہبی دنیا میں معمول بن چکی ہیں، مگر پھر بھی انھیں زیر بحث لانا ضروری ہے، اس لیے کہ دین اصل میں ایمان و اخلاق کا نام ہے۔ اس وقت مسلمانوں، بلکہ دنیا کے تمام تر مسائل کی بنیادی وجہ اخلاق سے دوری ہی ہے۔ الاستاذ جاوید احمد صاحب غامدی اپنی کتاب ''میزان'' میں ''اخلاقیات'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

> ''ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خلق اور خالق، دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے 'عمل صالح' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام شریعت اِسی کی فرع ہے۔ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو بے شک، تبدیل بھی ہوئی ہے، لیکن ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں، اِن میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ جو شخص اِن دونوں کے ساتھ اللہ کے حضور میں آئے گا، اُس کے لیے جنت ہے اور وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا۔'' (۲۰۱)

چنانچہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ بد گمانی کے حوالے سے کچھ یاددہانی حاصل کر لی جائے، اس لیے کہ انسان کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ مانی ہوئی باتیں بھی بھول جاتا ہے۔ قرآن مجید بھی اسی پہلو سے اپنے آپ کو Reminder

کہتا ہے۔ اصل دین اس قدر اہم ہے کہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کی تذکیر کرتے رہنا چاہیے۔ فرع سے اصل کی جانب سفر کرتے رہنا چاہیے۔ بصورت دیگر دین صرفی، نحوی، فنی، فقہی، تاریخی اور شخصی بحثوں کا میدان بن کر رہ جائے گا۔

سورۂ حجرات میں ہے:

''اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں۔'' (۴۹: ۱۲)

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ایسی باتوں سے روکا گیا ہے جو بظاہر تو معمولی نظر آتی ہیں لیکن یہ انسان کے خود اپنے دل کو ایسے روگ میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ تقویٰ کی روئیدگی کے لیے بالکل ناسازگار ہو جاتا ہے۔... بدگمانی: پہلی بات یہ اشارہ ہوئی کہ انسان اپنے دل کو دوسروں سے متعلق بدگمانیوں کی پرورش گاہ نہ بنالے کہ جس کی نسبت جو برا گمان بھی دل میں پیدا ہو جائے اس کو کسی گوشے میں محفوظ کر لے۔ انسان کو جن سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے ان کی بابت کوئی اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک امر فطری ہے۔ یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا یا توڑتا ہے۔ اس پہلو سے معاشرے میں یہ وصل و فصل کی بنیاد ہے۔... اہل ایمان کو اسلام نے اس باب میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے اِلّا آنکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس نیک گمان کا سزاوار نہیں ہے۔ یہ نیک گمانی اس ایمانی اخوت کا لازمی تقاضا ہے جس پر اسلام نے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے۔...۔ اگر کوئی شخص اس کے برعکس یہ اصول ٹھیرا لے کہ جو رطب و یابس گمان اس کے دل میں پیدا ہوتے جائیں ان سب کو سینت کے رکھتا جائے تو گمانوں کے ایسے شوقین کی مثال اس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہو جائے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لے۔''

(تدبر قرآن ۷/ ۵۰۸-۵۰۹)

بگوی صاحب نے اعتراض فرمایا ہے کہ:

''ایک صاحب مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی زندگی کے حالات قلم بند کر رہے ہیں۔ ان کی زیر ترتیب کتاب کا نام ''حیات امین احسن'' ہے۔ اصولی طور پر عنوان میں پورا نام آنا چاہیے، ادھورا نام نامناسب ہے۔ اس سلسلے میں ماہنامہ ''اشراق'' میں مسٹر محمد بلال کا ایک سلسلۂ مضامین جاری ہے جس کی ایک قسط (نومبر ۲۰۲۳ء) ہمارے سامنے ہے۔''

اس ضمن میں پہلے تو اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ کتاب ۲۰۱۶ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ ۲۰۲۳ء میں انٹرنیٹ پر اس کا e-book version شائع ہوا۔ اسی کتاب کو ''اشراق'' اقساط میں شائع کر رہا ہے۔ صنف کے

اعتبار سے یہ سوانح عمری ہے، مضمون نہیں۔ کتاب میں اس کا نام کچھ انداز سے لکھا گیا ہے:

حیاتِ امین احسن

(سوانح عمری مولانا امین احسن اصلاحی)

اس ضمن میں عرض ہے کہ کتاب کا نام رکھنا مصنف کے ادبی ذوق پر منحصر ہے، ادب کے دونوں مطالب کی رو سے کسی کے ذوقی معاملے پر نکتہ چینی کو مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں باباگورو نانک پر نظم لکھی تو اس کا عنوان صرف ''نانک'' قائم کیا۔ اسی نظم میں گوتم بدھ کا ذکر بھی کیا تو صرف ''گوتم'' کہہ کر کیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کتاب لکھی تو نام ''الفاروق'' رکھا، اور ''المامون'' کے نام سے مامون الرشید عباسی کی سوانح لکھی۔ مالک رام نے ابوالکلام آزاد کے خطبات کو ''خطبات آزاد'' کے نام سے مرتب کیا۔ ادب نثری ہو یا شعری، اس میں مانوس اور مختصر الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ تفصیل سے گریز اور اشاراتی انداز کو اختیار کیا جاتا ہے۔ ادب میں اختصار کو فصاحت کی روح سمجھا جاتا ہے۔ اور جو موسیقیت (Rhythm) اور روانی ''حیاتِ امین احسن'' میں ہے، وہ ''حیاتِ مولانا امین احسن اصلاحی'' میں نہیں ہے۔

اس موقع پر ایک اور تشویش ناک بات کرنا ضروری محسوس ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ مسئلہ ایمان کے بعد دین کے اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق کے بارے ہی میں ہے۔ مذہبی لٹریچر اور سوشل میڈیا کو دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے مذہبی لوگ نیکی، علم اور معلومات کے تکبر میں مبتلا ہیں۔ وہ جانے انجانے میں ان معاملات میں خود کو برتر اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، بلکہ حقیر قرار دیتے بھی ہیں۔ وہ دوسروں کو جاہل، کم علم یا مسٹر وغیرہ کہہ کر اپنے آپ کو بلند یا خاص مقدس مقام پر فائز کرتے ہیں۔ یہاں مولانا امین احسن کی کتاب ''تزکیۂ نفس'' یاد آتی ہے۔ وہ ''تکبر'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا کے حوالے سے بار بار عام کرنے کی ضرورت ہے:

> ''علم و معرفت کی راہ میں دوسرا بڑا حجاب تکبر ہے۔ تکبر کی تعریف خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرما دی... کہ جس کے دل کے اندر ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں داخل ہو گا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ خود صاحبِ جمال ہے اور جمال پسند فرماتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے۔ بعض لوگ اپنے

آپ کو اتنی بڑی چیز سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے اور ان کے یا ان کے زمرہ کے سوا کوئی اور شخص بھی کسی احترام یا اعتراف کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ان کو جو عزت و نعمت حاصل ہوتی ہے اس کو وہ اللہ کا فضل سمجھنے اور اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اس کو یا تو اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں یا اس کو اپنی کوشش اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے اور فخر کرتے ہیں۔... قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب سے پہلے خدا کی نافرمانی شیطان نے کی اور اس کی نافرمانی کی تہ میں یہی تکبر کا جذبہ کارفرما تھا۔... اس تکبر کے ساتھ حسد اور غصہ کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔" (۱۲۹-۱۳۱)

اسی طرح ڈاکٹر شرف الدین کے حوالے سے بگوی صاحب "خبث باطن"... "دل کی بیماری"... "سیلانی الطبع"... "غیر مستقل مزاج"... "بے خانماں زندگی گزاری"... جیسے الفاظ اگر استعمال نہ کرتے تو اچھا تھا۔ تنقید کرنے والے کے پاس دلائل مضبوط ہوں تو اسے ان دلائل تک محدود رہتے ہوئے پُر اعتماد رہنا چاہیے۔ یہ دلائل اس کے موقف کو اگر وہ درست ہے تو منوانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اور اگر دوسرے کا موقف کم زور ہو تو اسے وقت کی گزران خود ہی ختم کر دیتی ہے۔ مولانا وحید الدین خاں "آسان حل" کے تحت لکھتے ہیں:

"جھوٹی مخالفتوں کا سب سے زیادہ آسان اور کار گر جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ جھوٹی مخالفت ہمیشہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ اس کے لیے مقدر ہوتا ہے کہ اپنے آپ ڈھے پڑے۔ ایسی مخالفت کا جواب دینا گویا اس کی مدتِ عمر میں اضافہ کرنا ہے۔ اگر آدمی صبر کر لے تو بے جڑ درخت کی طرح ایک روز وہ اپنے آپ گر پڑے گی۔ وہ کبھی دیر تک خدا کی زمین پر قائم نہیں رہ سکتی۔

جھوٹ کا سب سے بڑا قاتل وقت ہے۔ آپ آنے والے وقت کا انتظار کیجیے۔ اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وقت نے اس فتنہ کو زیادہ کامل طور پر ہلاک کر دیا ہے جس کو آپ صرف ناقص طور پر ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے تھے۔" (کتاب زندگی ۱۴۷)

ایک مقام پر بگوی صاحب نے "المورد" کو تنظیم قرار دیا ہے، حالاں کہ "المورد" پہلے دن سے ایک ادارہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کے اصل معاملات کی طرف متوجہ رکھے، بدگمانی و تکبر کے ذرے سے بھی بچائے اور مخالفانہ صورت حال میں صبر کے ذریعے سے اللہ کی مدد حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد ذکوان ندوی

فطرت کی طرف

اشراق ہند، جنوری ۲۰۲۴ء میں ’’برکتوں کا خاتمہ‘‘ کے تحت راقم نے لکھا تھا کہ:

’’...اللہ اکبر، وہ زمانہ کیسی برکتوں کا زمانہ تھا۔ اب پیسوں کی بہتات ہے، مگر ہر جگہ طیبات کے گھٹنے اور خبائث ’کثُرَ الخَبَثُ‘ (مسلم، رقم ۷۲۳۵) کے بڑھ جانے کے سبب ’برکات‘ سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔ سادگی اور قناعت کے بجائے حرص و ہوس اور اسٹیٹس کی دوڑ، ’ضروریات‘ کے نام پر مادیات میں بے تحاشا اضافہ، حالات کے جبر و دباؤ اور ہماری بے حسی اور دنیا پرستی کے نتیجے میں صرف ڈیڑھ سو سال کے دوران اِس قدر زوال و اِدبار آیا اور برکات کا خاتمہ ہو گیا کہ بس اللہ کی پناہ:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!!

اِن ’برکات‘ کی اُس طرح واپسی آج کے حالات میں ممکن نظر نہیں آتی، اِلّا کہ آدمی حسب حالات اُس فطری اور غیر مصنوعی سطح حیات پر واپس لوٹنے کا فیصلہ کرے، یا خود کسی خدائی مداخلت کے ذریعے سے دجل کے اِس عالم گیر پردے کو چاک کر کے تمام فسادات کا خاتمہ کر دیا جائے۔

تاہم، ممکن دائرے میں اِن ’برکات‘ کے حصول اور ان کی واپسی کا عملی طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے دائرے میں لازماً اُن چیزوں کو کم ترین سطح پر لانے کی کوشش کریں جن کے ذریعے سے اِن برکات کا خاتمہ ہوا ہے، یعنی اپنے درمیان ’طیبات‘ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا اور ’خبائث‘ کو کم سے کم تر سطح پر پہنچا دینا؛ یہ امور خواہ داخلی ہوں یا خارجی، مادی ہوں یا روحانی، عملی ہوں یا نظری اور اعتقادی، عادات ہوں یا اشیاے استعمالات۔ مثلاً جسم اور روح کی پاکیزگی، ذکرِ الٰہی کی کثرت، دعا و تذکر، تلاوت و تدبر، صبر و قناعت، انسانی ہمدردی، لوگوں کے ساتھ

بہر صورت زیادہ سے زیادہ تعاون، یتیموں اور بے سہارا افراد کی خبر گیری اور کفالت ، نیز فطری طرزِ حیات کا زیادہ سے زیادہ فروغ، وغیرہ۔“(۳۹-۴۰)

دوا اور غذا

موجودہ زمانے میں خود دوا اور بنیادی غذائی اشیا میں عظیم فساد کی بنا پر 'تغییر خلق' (النساء ۴: ۱۱۹) کا چیلنج انسانیت کو درپیش ہے۔ اِس طرح عملاً ہر سطح پر انسان کو غیر انسان بنائے جانے (dehumanization) کا عمل انتہائی تیزی کے ساتھ جاری ہے۔

اِس کے نتیجے میں نہ صرف مہلک بیماری اور عدم تغذیہ کا ناقابل تلافی بحران پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اِس فساد کے ذریعے سے سرے سے اُس جوہر فطرت ہی کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جو نہ صرف وحی و دعوت کا مخاطب ہے، بلکہ یہی ربانی فطرت آدمی کا اصل امتیاز ہے۔ اِسی فطرت کی بنا پر انسان انسان ہے اور جب خود انسان کا انسان ہونا ہی خطرے میں پڑ جائے۔

سورۂ روم (۳۰) کی آیت ۳۰ سے متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں 'خَلْق' سے مراد وہ اصل فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہی فطرت ہے جس کو 'تقویٰ' اور 'فجور' (الشمس ۹۱: ۸) کا حامل بنایا گیا ہے۔ اِسی فطرت کے تحت آدمی حق و باطل کے درمیان تمیز کرتا اور خیر کو خیر اور شر کو شر سمجھتا ہے۔ انسان کے اندر یہ فطرت جب مسخ و تغییر کے فساد کا شکار ہو جائے تو پھر وہ انسان نہیں، بلکہ دو پیروں پر چلنے والا صرف ایک ایسا حیوان بن کر رہ جاتا ہے جس میں حیوانیت کے سوا انسان کے ساتھ اور کوئی مشابہت باقی نہیں رہتی۔

دور آخر میں ظاہر ہونے والے یہی وہ جینیاتی مقلوب افراد (GMS) ہیں جن کو احادیث میں 'حُثالة' (بخاری، رقم ۶۴۱۰) اور 'عَجاجة' (احمد، رقم ۶۹۶۴) کہا گیا ہے، یعنی بے خیر و بے فیض قسم کے پست و اراذل لوگ۔ اِنھی کے متعلق ارشاد نبوی ہے: 'لا یعرفون معروفًا، ولا یُنکرون منکرًا' (احمد، رقم ۶۹۶۴) یعنی اِن کو نہ کسی معروف کا شعور ہو گا اور نہ کسی منکر کا احساس۔

دوا اور غذا، وغیرہ میں پیدا شدہ اِن فسادات کی تفصیل کے لیے حسب ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:

1. Your Doctor Is A Liar, by James Paul Roguski
2. Death By Prescription: The Shocking Truth Behind an Overmedicated Nation, by Ray Strand
3. Safety Of Genetically Modified Foods National Research Council, Washington DC.

وقت اور صحت

ہمارے درمیان علم واخلاق اور تعلیم و تربیت کا جو بحران پیدا ہوا ہے، اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ وقت کی ناقدری اور غیر منصوبہ بند طرز حیات عرصے سے گویا اب ہمارا ایک قومی شعار بن چکا ہے۔ عام زندگی میں اِسی کا ایک ظاہرہ ہمارے اکثر لوگوں کا دیر سے سونا اور دیر سے اٹھنا ہے۔

کائنات کے خالق نے دن کو اصلاً کام کے لیے اور رات کو آرام کے لیے بنایا ہے (الفرقان ۲۵: ۴۷۔ النباء ۷۸: ۱۰-۱۱)۔ یہ صرف ایک سادہ مثال ہے، ورنہ موجودہ زمانے میں فطرت کے خلاف اِس قسم کے بہت سے 'فسادات' وانحرافات عام ہو گئے ہیں۔ جیسے ''ڈیولپمنٹ'' کے نام پر کھیت، درخت اور جنگلات کا خاتمہ کر کے ناقابل تلافی حد تک زمین کا توازن بگاڑ دینا، پانی، ہوا اور روشنی جیسی بنیادی اور فطری چیزوں کے حصول کو تمام تر کمرشلائز کر دینا، پانی جیسی عام نعمت کو خرید کر پینا، جو بلاشبہ تاریخ کی وہ بدترین غلامی ہے جس میں آج کا انسان ''جدید کاری و تہذیب'' کے پرفریب نام پر مبتلا ہے۔ اِسی طرح 'مصنوعی ذہانت' (AI) جیسا سنگین انسانی اور اخلاقی بحران، وغیرہ۔

فطرت کے خلاف مذکورہ قسم کی بے اعتدالی اور انحراف کوئی سادہ بات نہیں۔ قرآن کے مطابق، وہ نظام فطرت میں 'تغییر' (النساء ۴: ۱۱۹) اور زمین میں 'فساد' (الاعراف ۷: ۵۶، ۸۵) کے ہم معنی ہے۔ موجودہ حالات انسان کے اِنھی 'اعمال' (مفسدانہ سرگرمیوں) کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ اب جدید تہذیب اپنے اِس فساد کے مہلک انجام کو بھگت رہی ہے۔

اِس ہول ناک صورت حال سے نکلنے کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ آج کا انسان 'فساد بر و بحر' کی اِس حالت سے لوٹ کر دوبارہ 'صلاح بر و بحر' کی ربانی حالت کو مکمل طور پر اختیار کر لے۔ اِس کے سوا، خدا اور کائنات کی نسبت سے، اپنے جرم کو چھپانے کے لیے ''گلوبل وارمنگ'' کے نام پر کی جانے والی مختلف قسم کی سرگرمیاں ''پیوند کاری'' (patch up) سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اِس طرح کے بحرانی معاملات میں جوہری تبدیلی (sea change) مطلوب ہوتی ہے، نہ کہ مذکورہ قسم کی پیوند کاری۔ انسان کے ''ہاتھوں'' برپا ہونے والے اِس 'فساد' کا انجام بظاہر اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اب انسان اِسی دنیا میں اپنے اِس 'عمل' کا کچھ مزہ چکھے (الروم ۳۰: ۴۱)۔

ایک زندہ فرد اور قوم کی پہچان یہ ہے کہ وقت اُس کے نزدیک ''کاٹنے'' جیسی کوئی چیز نہیں ہوتا، بلکہ یہ

’زندگی‘ کا وہ قیمتی لمحہ ہوتا ہے جسے بھرپور طور پر وصول کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مشہور عربی مثل ہے: ’الوقتُ سیفٌ، إن لَمْ تَقْطَعْهُ قَطَعَكَ‘، یعنی وقت ایک تلوار ہے۔ اگر تم اُس کو نہ کاٹو تو وہ یقیناً تمھیں کاٹ دے گا۔ وقت کا کم تر استعمال ہمیشہ اُس کے برتر استعمال کی قیمت پر ہوتا ہے، جو بے شعوری کا نتیجہ ہے، اور اِس کا انجام محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک مغربی مفکر نے وقت کی اِسی اہمیت کے متعلق بجا طور پر کہا تھا کہ —— فارغ اوقات کا بہتر استعمال تہذیب کی آخری بلندی کی علامت ہے، اور ابھی بہت کم لوگ تہذیب کی اِس بلندی تک پہنچ سکے ہیں!

وقت کے استعمال کا بہترین طریقہ اپنے نشانے اور اپنے طے شدہ پروگرام کے اعتبار سے، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی ہے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی ترجیحات متعین کر کے اپنے وقت اور اپنی توانائی کو مسلسل اُسی محاذ پر صرف کرے۔

یہی صحت (health) کا معاملہ ہے۔ کسی آدمی کے پاس سب سے بڑی جو چیز ہوتی ہے، وہ وقت اور صحت ہے، مگر آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی بے شعوری کی بنا پر اِس معاملے میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ وقت اور صحت، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔

صحت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ہر اعتبار سے، سادگی اور اعتدال کو اختیار کرے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی تعیش اور خواہش پرستی کے بجائے ضرورت پر قانع رہے؛ وہ اعلیٰ معیار زندگی (high standard of living) اور نمایشی طرز حیات (ostentatious living) کے پر فریب ’نصب العین‘ سے اپنے آپ کو دور رکھے؛ وہ ورزش، چہل قدمی، کھیل کود اور زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کو اپنی زندگی کا مستقل معمول بنائے؛ وہ سادہ اور صحت بخش کھانے کو ترجیح دے اور شکم سیری کی مہلک عادت کے بجائے کم خوری کی صحت بخش عادت کا طریقہ اختیار کرے۔

واضح ہو کہ ’اعلیٰ معیار زندگی‘ کوئی سادہ چیز نہیں، وہ پورا ایک فلسفۂ حیات ہے جو مغرب کے ملحدانہ تصور کائنات (western world view) پر مبنی ہے۔

’قد أفلح مَن أسلَمَ، ورُزِق كَفافًا، وقنَّعَهُ اللهُ بما آتاه‘ (مسلم، رقم ۱۰۵۴)، یعنی بلاشبہ، کامیاب وہی شخص ہے جس نے اللہ کی فرماں برداری کی، اُس کو ضرورت بھر رزق ملا اور مزید کی فکر کرنے کے بجائے اُس نے اللہ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں پر دل سے قناعت اختیار کی۔

دور جدید میں پیدا شدہ اِس ’فساد‘ و ’تکاثر‘ سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

1. A Dictionart of Economics and Commerce: J. L. Hanson. Published by Mackdonald & Evans Ltd, London-1969.

2. The Development Dictionary- A Guide to Knowledge as Power, by Wolfgang Sachs. Zed Books, London & Newyork-2010.

3. The Affluent Society, by J. K. Galbraith. A Mariner Book, New York-1998.

[یکم مارچ ۲۰۲۴ء]

محمد بلال

حیات امین احسن

(۲۱)

مدرسۃ الاصلاح کے ساتھ تعلق

انسان نے جس ادارے سے تعلیم پائی ہو، اس کے ساتھ جذباتی تعلق ایک فطری بات ہے، مگر امین احسن کا مدرسۃ الاصلاح کے ساتھ تعلق بہت گہرا تھا۔ انھوں نے وہاں سے تعلیم ہی نہیں پائی، بلکہ تعلیم دی بھی اور اس کے سربراہ بھی رہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام انصاری لکھتے ہیں:

"مولانا امین اصلاحی کی انمول علمی یادگاروں میں مدرسۃ الاصلاح بھی شامل ہے۔ طالب علم اور استاد کی حیثیت سے انھوں نے وہاں تقریباً تیس برس گزارے۔ مادر علمی سے انھیں فطری طور پر قلبی تعلق تھا اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے وہ ہمیشہ خواہاں و کوشاں رہے۔ ایک جانب مولانا مرحوم کی صلاحیتوں کو نکھارنے، ان کے تحریری و تقریری جوہر کو چمکانے اور ان کے علم و فن کو گہرائی و گیرائی عطا کرنے میں مدرسہ کی تعلیم اور مولانا فراہی و دوسرے اساتذہ کی تربیت کا فیض رہا تو دوسری جانب مولانا مرحوم کی تفسیر "تدبر قرآن" اور دیگر علمی و دینی خدمات سے مدرسہ کی جو نیک نامی ہوئی، ہند و بیرونِ ہند کے ایک وسیع حلقہ میں اسے جو تعارف ملا، اور اس کے نظامِ تعلیم و تربیت کو جو قدر دانی نصیب ہوئی اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مدرسہ کے بہت سے فارغین اپنے نام کے ساتھ "اصلاحی" لکھتے ہیں لیکن مولانا مرحوم کے ساتھ یہ نسبت ایسی پختہ و معروف ہوگئی تھی کہ صرف "مولانا اصلاحی" کہنے پر اول وہلہ ذہن انھی کی طرف جاتا۔"

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۲)

مدرستہ الاصلاح سے متعلق ایک گروہ شکوہ سنج رہتا ہے کہ مولانا امین احسن نے جماعت میں شامل ہو کر مدرسہ کا حق ادا نہیں کیا۔ بہ الفاظ دیگر مدرسے سے بے وفائی کی ہے، جب کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جماعت میں ایک تاثر یہ موجود تھا کہ امین احسن کا دل مدرسہ میں لگا رہتا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔ اس میں امین احسن پر یہ ''الزام'' مذاق کے انداز میں لگایا گیا ہے، مگر ہر مذاق کے پیچھے کچھ نہ کچھ سنجید گی ضرور ہوتی ہے۔ حکیم مشتاق احمد اصلاحی بتاتے ہیں:

''۴۶-۱۹۴۵ء کے ایک اجلاس کا یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس اجلاس میں زیر بحث موضوع یہ تھا کہ تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی کا مرکز ہندوستان میں ہونا چاہیے یا پاکستان میں۔ مسئلہ چونکہ نہایت اہم تھا اور تحریک اسلامی کے مستقبل پر اس فیصلہ کے دور رس اثرات مرتب ہونے تھے، اس لیے امیر جماعت اسلامی سید مودودیؒ نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کے ارکان کے ساتھ تمام مقامی جماعتوں کے امراء کو بھی اجلاس میں شریک کیا جائے۔ اس اہم اجلاس میں، جماعت اسلامی فیروز پور چھاؤنی کا امیر ہونے کی وجہ سے مجھے بھی شریک ہونے کا موقع مل گیا۔ اجلاس مرکز جماعت سرنا (پٹھان کوٹ) میں سید مودودی کی زیر صدارت بعد نماز عشاء منعقد ہوا۔ مولانا کی دائیں جانب میاں طفیل محمد صاحب، چودھری محمد اکبر صاحب وغیرہ بیٹھے تھے اور بائیں جانب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، ملک نصر اللہ خان عزیز، غازی عبد الجبار صاحب تشریف فرما تھے۔ دائیں جانب کے ارکان جماعت کا مرکز، پاکستان میں رکھنے کے حق میں تھے اور بائیں جانب کے ارکان ہندوستان کے حق میں تھے۔ بحث کا آغاز مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تقریر سے ہوا۔ انھوں نے اپنے پر جوش خطاب میں جماعت اسلامی کا مرکز بھارت میں قائم رکھنے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے فرمایا کہ غیر مسلموں کے اندر اسلام کی دعوت قبول کرنے کے زیادہ امکانات ہیں (اس کے لیے انھوں نے کچھ دعوتی اور تبلیغی تجربات بھی بیان فرمائے کہ کس طرح جماعت اسلامی کا لٹریچر ہندوؤں کے اندر نفوذ کر رہا ہے) انھوں نے فرمایا: ''اگر جماعت اسلامی کا مرکز پاکستان میں رکھا گیا تو پاکستان کے مسلمان تحریک اسلامی کی زیادہ شدت سے مخالفت کریں گے، دوسری دینی جماعتیں جماعت اسلامی کو برداشت نہ کر سکیں گی، اسے خلاف قانون قرار دیے جانے کے مطالبات اٹھیں گے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ان کی رائے میں بہتر یہ تھا کہ تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی کا مرکز بھارت میں ہی رہنے دیا جائے اور پاکستان میں ذیلی دفتر قائم کر لیا جائے۔ جب مولانا اصلاحی اپنی تقریر ختم کر چکے تو میاں طفیل محمد صاحب نے جو کہ میرے قریب بیٹھے تھے نہایت ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں فرمادیا کہ چونکہ سرائے میر بھارت میں ہے

اس لیے جماعت اسلامی کا مرکز ہندوستان میں ہی ہونا چاہیے۔ میاں صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اصلاحی صاحب غصہ سے لال پیلے ہو گئے اور احتجاجاً یہ کہتے ہوئے اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ ''اچھا یہ سارے دلائل میں نے اپنے وطن کی وجہ سے دیے ہیں۔'' حالانکہ نہ میاں طفیل محمد صاحب نے یہ ریمارکس مولانا اصلاحی صاحب کی نیت پر کسی شائبہ کی بنا پر دیے تھے اور نہ حاضرین اجلاس نے میاں محمد طفیل صاحب کے اس فقرہ سے کوئی ایسا اثر ہی لیا تھا۔ کیونکہ تمام ارکان مجلس شوریٰ اور حاضرین اجلاس یہ جانتے تھے کہ کس طرح سید مودودی کے ایک حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے گھر بار اور وطن کو چھوڑ کر مولانا امین احسن اصلاحی پرنسپل ''مدرستہ الاصلاح'' سرائے میر ضلع اعظم گڑھ اپنے عہدے اور وطن کو خیر آباد کہہ کر بال بچوں سمیت سرنا (پٹھان کوٹ) میں منتقل ہو گئے تھے۔ مگر مولانا اصلاحی صاحب کے جذبات کی شدت سمجھیے کہ وہ اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ حاضرین اجلاس نے انھیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ اجلاس ان کی غیر حاضری کی وجہ سے تعطل کا شکار ہو گیا۔ بالآخر مرکزی سٹاف کے دو اصحاب کو مولانا اصلاحی صاحب کو منا کر اجلاس میں لانے کے لیے بھیجا گیا۔ قریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ اصحاب مولانا اصلاحی صاحب کو دوبارہ اجلاس میں لے آئے اور اس طرح اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔

متعدد ارکان شوریٰ نے بھارت اور پاکستان میں مرکز جماعت کے حق میں دلائل دیے۔ ان تقاریر کے بعد مولانا مودودی صاحب نے رائے شماری کرانے کا فیصلہ کیا۔ رائے شماری میں 3/4 حاضرین اجلاس نے جماعت اسلامی کا مرکز بھارت کی بجائے پاکستان میں منتقل کرنے کے فیصلہ کے حق میں ووٹ دیا اور اس طرح یہ مسئلہ حسن و خوبی سے طے ہو گیا۔'' (تذکرۂ مودودی ۵۸۱-۵۸۲)

آبائی وطن کے ساتھ تعلق

انسان دنیا کے کسی بھی خطے میں آباد ہو جائے، اسے اپنا آبائی وطن کبھی نہیں بھولتا۔ امین احسن کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی، امین احسن کے ساتھ اپنی ایک گفتگو نقل کرتے ہیں:

''س۔ مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی صاحب کی خواہش ہے کہ آپ ہندوستان تشریف لائیں؟

ج۔ ابو اللیث صاحب سے میرا ایک خاص تعلق ہے۔ ہندوستان سے اکثر ان کے پیغامات ملتے رہتے ہیں۔ میں ان کے جذبات و اشتیاق کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے خود ان سے ملنے کی شدید خواہش ہے کہ ان سے مل کر کچھ حسرتیں نکالوں۔ اگر میں ہندوستان میں ہوتا تو آج میرے یہ تمام چاہنے والے میری نظروں کے سامنے ہوتے۔ انھیں میرا اسلام کہو کہ وہ دین اسلام کے لیے کام کرتے رہیں۔

س۔نومبر میں ہونے والے فراہی سیمینار میں ہم آپ کو لے کر چلیں گے۔آپ صرف افتتاحی تقریر کریں۔

ج۔ابھی میں نے تمھیں اپنی صحت کے بارے میں بتایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ ہندوستان چلوں۔ اگر وہاں گیا تو میرے چاہنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔جماعت اسلامی دلی ہی میں گھیر لے گی،اعزہ کو معلوم ہوا کہ میں ہندوستان آکر ان سے نہ ملا تو وہ الگ ناراض ہوں گے،مادرِ علمی کے فرزندان بھی مجھے گھیرے میں لے لیں گے اور اعظم گڑھ میں ایک خاص حلقہ بھی مجھے نہ بخشے گا۔کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھے سیدھے لے جاؤ گے اور واپس لا کر لاہور پہنچا دو گے۔ایسا لگتا ہے کہ تم مجھے ڈربے میں بند کر کے رکھو گے۔میرے جانے پر ایک سیلاب ٹوٹ پڑے گا اور تم اس سیلاب کو روک نہیں سکتے۔”(سہ ماہی تدبر،اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۵)

خاندان اور خانگی امور سے تعلق

مولانا کی پہلی شادی ۱۹۲۳ء میں اصیل پور، پھریہا (اعظم گڑھ) کے راجپوت خاندان کی محترمہ رابعہ سے ہوئی، جن سے پانچ بچے: قمر النساء، شمس النساء، ابو صالح، ابو سعید اور ابو سعد پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں اہلیہ وفات پا گئیں۔ دوسری شادی ۱۹۴۵ء میں راہوں (جالندھر) کے چودھری عبدالرحمٰن کی صاحب زادی انوار الرحمت سے ہوئی، جن سے ایک صاحب زادی مریم ہوئیں۔[۱۵]

امین احسن اپنے بچوں کی ہر پہلو سے تربیت کے بارے میں بہت حساس تھے۔ ملتان نیو سنٹرل جیل سے ۲۰/ مئی ۱۹۴۹ء کو اپنے بیٹے ابو سعید اصلاحی صاحب کو خط میں لکھتے ہیں:

”پیارے بیٹے! تمھارے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پا کر بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ عزیز سلمہ، کو علمِ نافع اور عملِ صالح کی دولت دے اور اپنے دین کی خدمت کے لائق بنائے۔ امید ہے کہ تم اپنے بھائی جان کے ساتھ خوش رہو گے اور شوق سے پڑھو گے اور اپنی تمام عادتیں ایسی بناؤ گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند آئیں۔ اپنی امی اور اپنی آپا کو بھی برابر خط لکھتے رہو۔ اور اپنے ابو سعد بھائی کو بھی کبھی کبھی یاد کیا کرو۔ نماز پڑھنے کی عادت اب پختہ کر ڈالو اور غصہ جو تم میں بہت زیادہ ہے اس کو کم کرو یہ بہت بری چیز ہے۔ اس گرمی میں دھوپ میں نہ پھرنا اور روزانہ کم از کم ایک دفعہ ضرور نہانا۔

---

[۱۵] ماہنامہ شمس الاسلام، بھیرہ، مولانا امین احسن نمبر، دسمبر ۲۰۱۵ء، ۸-۱۰۔

میں خدا کے فضل و کرم سے بہت اچھا ہوں۔ پچھلے ہفتہ میں طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی، اب اس کا کوئی اثر باقی نہیں ہے۔ دوسرے حضرات بھی بخیریت ہیں۔ وہاں تمام حضرات کو میرا سلام کہو اور اپنے ساتھیوں کو دعا۔ تمھارے بھائی جان جب خط لکھیں اس میں تم اپنا رقعہ ضرور ڈال دیا کرو اور اگر وہ خط نہ لکھیں تو تم اوپر لکھے ہوئے پتہ پر خود خط لکھا کرو۔ مجھے تمہاری خیریت کے لئے بڑا انتظار رہتا ہے۔“

(سہ ماہی تدبر جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۲-۴۳)

اپنے بڑے بیٹے ابو صالح اصلاحی کے نام ملتان نیو سنٹرل جیل سے ۳/ فروری ۱۹۵۰ء کو لکھتے ہیں:

”مجھ پر ہلکا سا حملہ ملیریا کا ہو گیا تھا، مگر اب اچھا ہوں انگریزی کتاب اب تک نہیں ملی۔ یا تو تم نے ہی نہیں بھیجی یا ابھی سنسر والوں کے زیر مطالعہ ہے۔ دو چار دو پلی ٹوپیاں بھجواؤ۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں کپڑے کی ٹوپیاں سلوانا ایک جہاز بنوانے سے زیادہ مشکل کام ہے، مگر توجہ کرو گے تو کوئی مہاجر درزی سی ہی دے گا۔ ابو سعید سلمہٗ کو دعا۔ معلوم نہیں ان کی ”عبادت“ کا کیا حال ہے۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۹۰)

ملک عبد الرشید عراقی صاحب کے نام لاہور سے ۲/ جنوری ۱۹۸۰ء کو اپنی اہلیہ کی علالت کے باعث اپنی کیفیت بیان کرتے ہیں:

”میں اہلیہ کی مسلسل علالت کے سبب سے ۴، ۵ ماہ سے یہیں مقیم ہوں (ڈاکٹر زاہدہ درانی کلینک لاہور میں قیام مراد ہے۔ مدیر) رقبہ پر کسی شدید ضرورت ہی سے جاتا ہوں اس دوران میں میری ڈاک برابر گڑ بڑ رہی بے اطمینانی کے سبب سے پتہ تبدیل نہ کرا سکا۔ منشی جب گاؤں سے آتا ہے تو ڈاک لاتا ہے اور وہاں بھی ڈاک کی تقسیم کا کوئی نظم نہیں ہے۔ اس وجہ سے میری ڈاک بیشتر اسکول کے بچوں ہی کی نذر ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام اور غیر حاضری کی معذرت کیجیے۔ اگر آپ حضرات نے لاہور تشریف لانا ہو تو مذکورہ پتہ پر ملاقات ہو سکتی ہے اور مجھے اس ملاقات سے دلی مسرت ہو گی۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۹۶)

ابو صالح اصلاحی کی موت کا حادثہ

سب سے بڑے اور ہونہار بیٹے ابو صالح اصلاحی کی جوانی میں موت کا حادثہ حیات امین احسن کا بڑا دردناک باب ہے۔ امین احسن ایک باپ بھی تھے اور قرآن کے عالم بھی۔ ان دونوں حیثیتوں کے باعث اس موقع پر ان کے اندر جذبات کی کیسی کشمکش برپا ہوئی، اس کا اندازہ ان تحریروں سے ہوتا ہے جو انھوں نے اس ضمن میں لکھیں۔ اس معاملے میں انھوں نے ایک بے حد دلچسپ اور فکر انگیز سچا خواب بھی بیان کیا ہے، جو ایک باپ

کے لیے قلبی سکون کا باعث بنا:

”۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو قاہرہ کے قریب، پی آئی اے کے طیارے کو جو المناک حادثہ پیش آیا وہ یوں تو پورے پاکستان کا ایک المیہ ہے، ہماری پوری قوم کو اس سے صدمہ پہنچا ہے اور میں اس میں قوم کے ساتھ برابر کا شریک ہوں، لیکن میرے لیے یہ حادثہ دہرے رنج و غم کا باعث ہوا ہے اس لیے کہ میرے جوان بیٹے ابو صالح اصلاحی نے بھی اس حادثے میں شہادت پائی۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا ایک کمزور انسان ہوں۔ عام حوادث سے بھی، جن کی خبریں اخباروں میں روز چھپتی رہتی ہیں، بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں، پھر ایک ایسے حادثے کے اثرات سے اپنے دل کو کیسے بچا پاتا جس نے میرے پورے آشیانے کو سوخت کر کے رکھ دیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ دن مجھ پر بہت سخت گزرے ہیں۔ اتنی عمر میں ایسے سخت دن مجھ پر نہیں گزرے تھے۔ اگرچہ حادثہ کی خبر سنتے ہی میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیا تھا کہ اے رب! اگر یہ تیرے غضب کا نتیجہ نہیں ہے تو میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں۔ تو مجھے صبر و رضا کی توفیق عطا فرما! لیکن اس کے باوجود اس دوران میں میری عقل اور میرے دل میں برابر ایک جنگ برپا رہی ہے اور بارہا میں نے شب کی تنہائیوں میں یہ محسوس کیا ہے کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آ رہے ہیں۔ لیکن اب ان جذبات کا ذکر چھیڑ کر اپنے اور اپنے ہمدردوں کے غم میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں ربِ کریم کی طرف سے ظہور میں آئی ہیں اور جن سے مجھے اس غم و الم کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سفر میں ابو صالح مرحوم نے عمرہ کی نیت کی تھی اور اس کے لیے وہ تمام ضروری تیاریاں کر کے گھر سے نکلے تھے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع میرے برادرِ نسبتی چوہدری فضل الرحمان محمود سلمہٗ کو تو کئی ماہ پہلے سے تھی لیکن سفر سے پہلے انھوں نے اس کی خوشخبری اپنی امی کو اور ان کی وساطت سے گویا مجھے بھی دے دی تھی۔ میں مئی کے شروع میں زمین داری کے انتظامات کے سلسلے میں اپنے رقبے پر چلا گیا تھا۔ وہاں مجھے یکے بعد دیگرے ایسے کام پیش آتے گئے کہ توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ میری اس غیر معمولی تاخیر سے گھبرا کر میری اہلیہ اور میری چھوٹی لڑکی بھی وہیں پہنچ گئیں۔ حادثہ سے ایک دن پہلے میری اہلیہ نے ذکر کیا کہ ابو صالح مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا: یہ کیا نئی بات ہوئی، وہ تو چین، ماچین، امریکا اور انگلستان برابر جاتے ہی رہتے ہیں؟ انھوں نے کہا: نئی بات یہ ہے کہ اب انھوں نے عمرہ کی نیت کی ہے۔ میرے پاس آئے تو کہتے تھے امی! آپ تو مجھے دین سے بے پروا سمجھتی ہیں لیکن میں عمرہ کی نیت کیے

ہوئے ہوں، اس سفر سے عمرہ کر کے لوٹوں گا۔ میں دن میں دفتر کے کام کرتا ہوں، رات کو حج کی دعائیں یاد کرتا ہوں۔ حج کے سفر نامے میں نے کئی ایک پڑھ لیے ہیں، اگر کوئی ایسا سفر نامہ آپ نے پڑھا ہو جس میں حج کی روحانیت بیان ہوئی ہو تو وہ مجھے بتائیے، ابا جان سے بھی پوچھیے گا۔ میں نے کہا: ہاں! یہ خبر تو بے شک نئی خبر ہے۔ اس اطلاع سے مجھے فی الواقع بڑی خوشی ہوئی تھی۔

ابو صالح نے اس نوجوانی کی عمر میں اخبار نویسی میں جو ناموری حاصل کر لی تھی اور زندگی کی جدوجہد میں اسے جو کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی تھی وہ اگر ایک طرف قابل رشک تھی تو دوسری طرف ایک خاص پہلو سے میرے لیے وجۂ تشویش بھی تھی۔ میرا دل اندر سے ڈر رہا تھا کہ مبادا! ان کامیابیوں کا نشہ اس کو آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ میں اس کے لیے برابر دعا کرتا رہتا تھا کہ اے رب! تو نے اس کو دنیا دی ہے تو دین کی راہ بھی اسے سجھا! اس کی امی برابر، جب وہ ہم سے ملنے آتا، نماز کی پابندی کی بحث اس سے ضرور چھیڑتیں۔ میں نے بھی اس سے ایک آدھ بار کہا کہ ابو صالح! تم قابل فخر بیٹے ہو! اگر تم دین دار بن جاؤ تو میں تمھارے جیسے بیٹے پر اپنے رب کا شکر بھی ادا کروں۔ اس میں غفلت ضرور تھی لیکن طبیعت بڑی نصیحت پذیر تھی۔ دین کے لیے اس میں حمیت بھی بہت تھی۔ اب میں اس کی اس غربت کی موت کا خیال کرتا ہوں، ان آگ کے شعلوں کا تصور کرتا ہوں جن میں اس کا جسم اور میرا دل کباب ہوا ہے، ایک حریق اور غریق مومن کے لیے اس شہادت کو یاد کرتا ہوں جس کا ذکر حدیثوں میں ہے اور پھر اس کی عمرہ کی اس نیت کا دھیان کرتا ہوں تو میرا سینہ اس اچھی امید سے لبریز ہو جاتا ہے کہ کیا عجب! رب رحیم و کریم نے اس الھڑ نوجوان کو اپنی جنت میں لے جانے کے لیے یہ مختصر راستہ ہی پسند فرمایا ہو! یہ امید میرے غم کو اتنا کم کر دیتی ہے کہ بعض اوقات تو میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ گویا کوئی حادثہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

ایک اور چیز، جو سب سے زیادہ میرے غم کو دور کرنے میں معین ہوئی، وہ میرے ایک دیرینہ رفیق کا خواب ہے۔ میں اگرچہ خواب کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن یہ ایک ایسے شخص کا خواب ہے جس کے خوابوں کے سچے ہونے کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں ایک زمانے میں ان کے ساتھ کم و بیش دس ماہ بورسٹل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں گزار چکا ہوں۔ اس زمانے میں انھوں نے پیش آنے والے معاملات سے متعلق نہایت حیرت انگیز خواب دیکھے اور ان کے سارے خواب سچے ثابت ہوئے۔ انھوں نے ۳۱/۳۰ مئی کی درمیانی رات میں، صبح تقریباً چار بجے، مندرجہ ذیل خواب دیکھا جو خود ان کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

ابو صالح اصلاحی مرحوم، رات کے لباس میں ملگجے رنگ کے بوشرٹ اور پاجامے میں ملبوس ہشاش بشاش

نظر آئے۔ کہنے لگے کہ مجھے صرف آدھ گھنٹہ تکلیف رہی۔ اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں (یہ بات انھوں نے دو تین دفعہ کہی)۔ میں نے کہا: آپ کے والد مولانا اصلاحی صاحب اس حادثہ کی وجہ سے سخت غم زدہ ہیں۔ کہنے لگے ہاں! ٹھیک ہے۔ انھیں سخت غم ہے اور کیوں نہ ہو، اب پوری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آن پڑی ہیں۔ نیز کہنے لگے: آپ میرا (پیغام جو اوپر نقل ہوا) میرے گھر والوں کو پہنچا دیں۔ میں نے کہا (اور احساس یہ تھا کہ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں) کہ یہ خواب باتیں شاید وہ مانیں یا نہ مانیں، میں جا کر کیا message دوں گا۔ لیکن انھوں نے باصرار دو تین دفعہ کہا کہ آپ کو اس سے کیا، آپ پیغام دے دیں، وہ مانیں یا نہ مانیں ان کی مرضی!

خواب خاصا لمبا تھا، باتوں کی ترتیب پوری طرح یاد نہیں رہی لیکن گفتگو کے وہ حصے ذہن پر ابھی تک نقش ہیں جو اوپر لکھ دیے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا کہ ان کے تین چار دوست ان کے قریب ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور بغیر داڑھی مونچھ کے سفید قمیص اور پتلون میں ملبوس ہیں۔ ان میں سے ایک نے ابو صالح سے پوچھا: بھئی! نماز کا وقت ہو رہا ہے (اس وقت واقعی فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا) ہمیں وضو کرنا ہے جگہ تو بتاؤ۔ اس پر ابو صالح نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے میز والے کمرے کے ساتھ غسل خانہ ہے، وہاں وضو کر لیں۔

اس خواب کی تعبیر تو اربابِ تعبیر بتا سکیں گے لیکن چند باتیں اس کی مجھ پر بالکل واضح ہیں اور وہی میرے لیے موجب اطمینان و تسلی ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ خواب دیکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں جن سے اگرچہ ایک مدت سے میرا کوئی ربط ضبط نہیں ہے لیکن وہ واحد شخص ہیں جن کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ان کے خواب سچے ثابت ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان کے واسطہ سے ابو صالح مرحوم کا کوئی پیغام میرے لیے اطمینان کا پہلو رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حادثے کے بعد دو تین دنوں کے اندر اندر میں نے غم کے تمام اسباب کا تجزیہ کر کے ان میں سے اکثر پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن ایک سوال میرے لیے برابر سوہانِ روح رہا ہے کہ حادثہ کے وقت اور حادثہ کے بعد رب کریم نے ابو صالح کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رات میں جب یہ سوال میرے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے تو نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش بار بار پیدا ہوئی کہ کوئی بات میرے سامنے ایسی آئے جس سے میرے دل پر سے یہ پہاڑ ذرا سر کے، خواب ہی میں سہی، لیکن میں خود خواب اول تو دیکھتا کم ہوں اور جو دیکھتا ہوں وہ یاد نہیں رہتے۔ اب جب سے یہ خواب علم میں آیا ہے، خیال یہی گزرتا ہے کہ یہ

میرے اسی سوال کا جواب ہے اور اگر یہ واقعی میرے سوال کا جواب ہے تو بہت ہی خوب اور نہایت مبارک جواب ہے۔

بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست!

خواب میں ابو صالح کے لباس شب خوابی کا جو رنگ نمایاں ہوا ہے گھر میں دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کے سلیپنگ سوٹ کا رنگ فی الواقع وہی تھا۔ اسی طرح ان کا وہ کمرا جس میں ان کے کھانے کی میز ہے ان کے صاف ستھرے غسل خانے سے متصل ہے۔ ان چیزوں کا کوئی تصور خواب دیکھنے والے صاحب کو پہلے سے نہیں تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس حادثے نے مجھے اندر سے بالکل ہلا ڈالا تھا لیکن اب میرے رب نے مجھے سنبھال لیا ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں رونے کو اب بھی جی چاہتا ہے لیکن الحمد للہ! اس معاملے میں مجھے اپنے پروردگار سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا دل بالکل مطمئن ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اسی میں سب کی بہتری ہے۔ مرحوم کی بھی، اس کے ننھے ننھے بچوں کی بھی، اس کی غمزدہ بیوہ کی بھی، اس کے غمگیں ماں باپ اور بھائیوں بہنوں کی بھی! میں اس موقع پر ان تمام مخلصین اور ہمدردوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مرحوم کے لیے دعائیں کی ہیں اور تعزیت کے کلمات سے ہمارے غم میں شرکت کی ہے۔ جن مخلصین نے خطوط لکھے ہیں اگر میرے لیے ممکن ہو سکا تو میں ان کا جواب لکھوں گا اور ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو مجھے امید ہے کہ یہ مخلصین مجھے معذور سمجھیں گے اور مرحوم کو اس کے بچوں کو اپنی دعاؤں میں برابر یاد رکھیں گے۔ ماہنامہ میثاق لاہور جون ۱۹۶۵'' (مقالات اصلاحی ۲/ ۳۸۴-۳۸۷)

اس کے علاوہ یہ حادثہ کہاں کہاں اور کیسے کیسے اثر انداز ہوا، اس کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میثاق کا یہ شمارہ نہایت پریشانی کے حالات میں مرتب ہوا ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا لکھا گیا ہے اور کیا چھپا ہے۔ تاخیر تو عام حالات میں بھی اس رسالہ کا معمول بن چکی تھی، لیکن اب تو جن حالات و مسائل میں میں گھر گیا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ بے نظمی و بے قاعدگی کے ساتھ بھی یہ پرچہ جاری رہ سکے گا یا نہیں۔ اس دوران میں مجھے نقل مکان کی الجھنوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، اس لیے کہ ابو صالح مرحوم کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے مجھے رحمان پورہ سے منتقل ہو کر فیروز پور روڈ پر آنا پڑا اور اب تک کوئی ایسا مکان حاصل نہیں ہو سکا ہے جس میں ان بچوں کے ساتھ یکجا قیام کی صورت پیدا ہو سکے۔ میثاق کا دفتر بھی ابھی ایک عارضی جگہ پر ڈال دیا گیا ہے۔ ہر چیز الجھی ہوئی ہے اور صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ اس الجھاؤ کے سلجھنے کی کوئی شکل نکلے گی یا نہیں!

میں اب ایک عرصہ سے تفسیر تدبر قرآن اور حلقۂ تدبر قرآن کے سوا دوسرے تمام کاموں سے تقریباً الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ ذمہ داریاں خواہ گھر کی ہوں یا باہر کی ان سے جی گھبراتا تھا۔ معاشی مجبوریوں کے سبب سے زمین داری کی تھوڑی سی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی لیکن یہ کام بھی مارے باندھے ہی کرتا تھا۔ لڑکوں نے اپنی ذمہ داریاں خود نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال لی تھیں اور اب وہ اس قابل تھے کہ مجھے امید تھی کہ مجھ سے متعلق جو بعض ذمہ داریاں باقی رہ گئی ہیں ان سے وہ مجھ سے زیادہ خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ لیکن ابو صالح مرحوم کی ناگہانی موت نے حالات کا سارا نقشہ ہی بدل دیا۔ اب نہ صرف میری ذمہ داریاں مجھ سے از سر نو توجہ کا مطالبہ کر رہی ہیں بلکہ مرحوم ابو صالح نے اپنی ذمہ داریاں بھی میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی ہیں۔ اس نے چھوٹے چھوٹے چھ بچے چھوڑے ہیں جن میں سے بڑی بچی کی عمر کل آٹھ سال ہے۔ ان بچوں کی اٹھان ایک خاص نہج پر ہوئی ہے۔ مجھ سے دور رہنے کے سبب سے یہ مجھ سے اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہیں۔ ان کے بھولے پن کا ہی عالم ہے کہ میری ایک پوتی جو شکل و شباہت اور مزاج و عادات میں اپنے مرحوم باپ کا کامل نمونہ ہے، ایک شب میں سوتے وقت اپنی نانی اماں سے پوچھ بیٹھی کہ، اماں! اللہ میاں کس چیز کی فراک پہنتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نور کی! یہ جواب اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ صبح کو جب وہ اٹھی اور اس کی نانی نے اس کو نہلا کر اس کی فراک بدلنے لگیں تو وہ مچل گئی کہ میں تو نور کی فراک پہنوں گی! اور نور کی فراک کے لیے ایسی بضد ہوئی کہ سارے گھر کے لیے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے جدید کلامی دلائل کے ساتھ مداخلت کرنی پڑی تب کہیں جا کر یہ نزاع ختم ہوئی۔

مولانا شبلی نعمانی نے اپنے بھائی مولوی اسحاق مرحوم کا جو درد انگیز مرثیہ لکھا ہے وہ بچپن میں مجھے پورا زبانی یاد تھا اور اس کے جو شعر مجھے خاص طور پر پسند تھے ان میں وہ شعر بھی تھا جس میں مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے بچوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

یہ شعر میں اکثر نہایت رقت انگیز انداز میں پڑھا کرتا تھا۔ اب یہ راز کھلا کہ یہ شعر مجھے اس درجہ کیوں پسند تھا۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے اس شعر میں اپنے ہی درد دل کی کہانی نہیں سنائی تھی بلکہ اس میں میرا درد دل بھی شامل کر دیا تھا۔ میرا یہ ایک مستقل نظریہ ہے کہ آدمی کو شعر وہی پسند ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے دل کی صدائیں سنتا ہے۔

مجھے اچھی طرح علم ہے کہ آدمی پر ذمہ داریاں خدا ڈالتا ہے اور وہی ان کے اٹھانے کی توفیق وہمت بھی عطا فرماتا ہے۔ میں جو خوف وہراس محسوس کر رہا ہوں یہ محض علم کی کمی اور طبیعت کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔ جو امتحان باقی ہیں وہ ہو کر رہیں گے۔ وہ اس وجہ سے نہیں ملتوی ہو جائیں گے کہ میں امتحان سے گھبراتا ہوں اور کمر کھول کر اب ستانے اور آرام کرنے کا خواہشمند ہو گیا ہوں۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔ اسی سے بندے کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی اور اس کی کمزوریاں دور ہوتی ہیں۔ آدمی کا بڑھاپا بھی اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ بڑھاپے میں جس طرح جسمانی بیماریاں اور کمزوریاں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح عقل وایمانی بھی لاحق ہوتی ہیں۔ آدمی جب عصائے پیری کا محتاج ہوتا ہے تو بہت سی غلط چیزوں پر تکیہ کرنے لگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی توحید کے معاملے میں بڑا غیور ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا بندہ کسی اور پر اعتماد کرے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عمر میں آکر میرے اندر بھی غلط قسم کا اعتماد پیدا ہو چلا تھا، اگرچہ میری کوئی ضرورت ابو صالح سے وابستہ نہیں تھی مگر ایک باپ کو اپنے بیٹے پر جو فخر و ناز ہوتا ہے غیر محسوس طور پر وہ میرے اندر بھی تھا۔ اس کی شہرت و ناموری سے میرے دل کو خوشی ہوتی تھی۔ لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے تو میرے خون میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس کے بھرے گھر کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوتا تھا۔ میں جب پیار سے یا غصہ سے اس کو بیوقوف کہتا تھا اور وہ مسکرا کر نگاہیں نیچی کر لیتا تھا تو مجھے فخر ہوتا تھا کہ میں ملک کے ایک نامور صاحب قلم اور چوٹی کے صحافی کو بیوقوف کہہ دیتا ہوں اور وہ میرے اس خطاب پر خوش ہوتا ہے۔ اس طرح غیر محسوس طور پر میں نے ابو صالح کے اعتماد پر اپنے دل کے اندر پندار کا ایک صنم خانہ تعمیر کر لیا تھا۔ قدرت نے ۲۰/ مئی ۱۹۶۵ء کی صبح کو اس صنم خانے کو ڈھا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس حادثے سے بڑا غم ہوا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حادثے کے بعد سے میرے اور میرے پروردگار کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں رہا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ اس حال میں کرے کہ میرا دل اعتماد غیر کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ ماہنامہ میثاق لاہور، جولائی ۱۹۶۵‘‘ (مقالات اصلاحی ۲/۳۸۹-۳۹۱)

ابو صالح کی صالحیت کی وضاحت کرتے ہوئے امین احسن بتاتے ہیں:

’’مرحوم کے بعض دوستوں کی باصرار یہ خواہش ہے کہ میں اس کے ابتدائی حالات اور اس کے مزاج کی خصوصیات پر ایک مضمون لکھ دوں۔ یہ مضمون میں ان شاء اللہ لکھ دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میری کوشش یہ ہے کہ دل پر اس کے تصور کا جو غلبہ ہے وہ کچھ کم ہو تا کہ میں کچھ پڑھنے لکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہو سکوں۔ میرا یہ گمان نہیں ہے کہ ابو صالح میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ نہیں! اس میں نقائص بھی تھے

لیکن میں ان نقائص میں اپنے نقائص کا عکس دیکھتا تھا۔ اس کی امی جب اس طرح کی کسی چیز کی شکایت کرتیں تو میں ان کو جواب دیتا کہ اس چیز کی فکر نہ کرو، یہ چیز اس نے باپ سے وراثت میں پائی ہے۔ جس طرح باپ کے دماغ کو عمر اور تجربے نے درست کر دیا ہے، اسی طرح عمر اور تجربہ سے اس کا دماغ بھی درست ہو جائے گا۔ مجھ سے، میرے خاندان کی روایات کے زیر اثر، اس کو ایک حجاب سا رہا لیکن یہ حجاب محض ظاہر کا پردہ تھا، اس پردے کے پیچھے جس طرح وہ میرے دل میں بسا ہوا تھا، اسی طرح میں بھی اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ بھائیوں، بہنوں، اور عزیزوں سے اسے نہایت گہری محبت تھی۔ اپنی چھوٹی بہن —— مریم صدیقہ —— کو پیار سے ہمیشہ منی! کہتا تھا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش بلا تاخیر پوری کرتا تھا۔ پچھلے دنوں میں بیمار ہو گئی تو تیمار داری اور دیکھ بھال میں اس نے رات دن ایک کر دیے۔ اس کے آپریشن کی نوبت آئی تو لاہور میں جو بہتر سے بہتر انتظام ممکن تھا اس نے وہ کیا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی —— ابو سعد سلمہٗ —— بھارت میں ہے اس کے لیے وہ مجھ سے زیادہ فکر مند رہتا تھا۔ اپنے دوسرے چھوٹے بھائی ابو سعید سلمہٗ کو اس نے تعلیم دلائی اور اگست ۱۹۶۵ء میں اس کے امریکہ جانے کا پروگرام تھا۔ طبیعت نہایت خود دار، فیاض اور غمگسار پائی تھی۔ اس کے اخلاق سے متعلق نہ صرف یہ کہ کبھی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی بلکہ اس کے خاص دوستوں نے بقید قسم یہ شہادت دی کہ اس سے زیادہ پاکیزہ نگاہ نوجوان انھوں نے نہیں دیکھا! میں جانتا ہوں کہ یہ چیز اس میں بربنائے تقویٰ نہیں تھی بلکہ محض طبیعت کے ترفع کا نتیجہ تھی لیکن میں مطمئن تھا کہ اس ترفع نے اسے بہت سے فتنوں سے محفوظ رکھا۔ اس ترفع ہی کا ایک پہلو یہ تھا کہ معیار زندگی اونچا رکھنے کے باوجود مکان پر نام کی تختی نہیں لگواتے تھے، گھر پر فون نہیں رکھتے تھے، اخبار میں اپنی تصویر نہیں چھپواتے تھے، بلکہ تاکید تھی کہ اگر کسی گروپ کے ساتھ ان کی تصویر بھی ہو تو ان کی تصویر کاٹ کر گروپ کی تصویر اخبار میں دی جائے۔ اسی طرح اپنے مخصوص کالم پر جس کی اخباری دنیا میں بڑی دھوم تھی، کبھی اپنا نام نہیں دیا۔

صحت بہت اچھی تھی، آنکھیں ہمیشہ ہنستی ہوئی رہتی تھیں، مطالعہ بہت کرتے تھے اور معلومات بہت وسیع تھیں لیکن مطالعہ اور معلومات کا بوجھ چہرے بشرے سے نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ چہرہ ہمیشہ تازہ گلاب کی طرح شگفتہ رہتا۔ تفریحات میں سے صرف احباب کے ساتھ مجلس آرائی سے دلچسپی تھی۔ ان کے اکثر احباب عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن مشہور روایت یہی ہے کہ جس مجلس میں ہوتے اپنے حسن بیان، اصابتِ رائے اور وسعت معلومات کی وجہ سے نمایاں رہتے۔ دل میں دنیا حاصل کرنے کی خواہش تھی لیکن بڑی خود داری اور اصول کے ساتھ! پچھلے دنوں ایک خاص حلقے کی طرف سے بڑی اہم پیشکش ہوئی لیکن انھوں نے نہایت

بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دی۔ حلقۂ ملاقات و تعلقات ہر طبقے میں بہت وسیع تھا لیکن اس سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس سے دوسرے ضرورت مندوں کو فائدے پہنچائے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کمزوریوں سے درگذر فرمائے اور اس کی نیکیوں کو قبول فرمائے! ماہنامہ میثاق لاہور، جولائی ۱۹۶۵"(مقالات اصلاحی ۲/ ۳۹۲)

[باقی]

Monthly
ISHRAQ
Lahore

June 2025
Vol.37 No.6
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق